وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد ۲۱ ○ شمارہ نمبر ۹ ○ ستمبر ۲۰۱۰ء

بیاد

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ

رئیس التحریر

ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر

محمد عمار خان ناصر

مجلس مشاورت

پروفیسر غلام رسول عدیم

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن

پروفیسر محمد اکرم ورک

مولانا حافظ محمد یوسف

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ

شبیر احمد خان میواتی

انتظامیہ

ناصر الدین عامر / عبدالرزاق

حافظ محمد سلیمان / حافظ محمد طاہر

فہرس

کلمہ حق

افراد کی غلامی سے قوموں کی غلامی تک — رئیس التحریر — ۲

آرا و افکار

سرسید کی تفسیری تجدد پسندی۔ایک مطالعہ — ڈاکٹر محمد شہباز منج — ۵

تذکرہ و سوانح

آفتاب معرفت: شیخ المشائخ حضرت خواجہ خان محمدؒ — مولانا شیخ رشید الحق عابد — ۹

مباحثہ و مکالمہ

اسلامی بینکاری: زاویہ نگاہ کی بحث (۲) — زاہد صدیق مغل — ۳۷

قادیانی مسئلہ۔حقائق کیا ہیں؟ — ڈاکٹر محمد عمر فاروق — ۵۲

اخبار و آثار

ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام کانفرنس — ۵۶

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی سالانہ رپورٹ — ۶۱

زر تعاون	خط و کتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 150 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعہ اکادمی	حافظ محمد طاہر
بیرون ملک سے	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
20 امریکی ڈالر	aknasir2003@yahoo.com	055-4000394	0306-6426001

ناشر: حافظ محمد عبدالمتین خان زاہد ۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

’’ہمیں اپنی ترجیحات میں ایک عرصہ تک سیلاب زدہ بھائیوں کی آباد کاری اور بحالی کے کاموں کو اولیت دینا ہوگی، مگر اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی قومی کوتاہیوں، اجتماعی گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اسباب کے حوالے سے اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات پر نظر ثانی کریں، توبہ و استغفار کا اہتمام کریں، قرآن و سنت کی طرف واپسی کا راستہ اختیار کریں اور انابت الی اللہ کا عمومی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔‘‘ [کلمہ حق]

افراد کی غلامی سے قوموں کی غلامی تک

جنیوا سے جاری کی جانے والی اقوام متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ’’انسانوں کی تجارت جدید دور میں غلامی کی ایک شکل ہے اور یہ لعنت دنیا کے ہر علاقے میں موجود ہے۔ محنت ومشقت اور جنسی استحصال کے لیے مردوں، عورتوں اور بچوں کی اسمگلنگ اور ان کی خرید وفروخت مجرموں کے منظم گروہوں کے لیے پیسہ بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ انسانی تجارت کا شکار ہونے والی لڑکیوں کو مکروہ دھندے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسانوں کی تجارت جتنی زیادہ عام ہے، اتنی ہی اس کے بارے میں معلومات کم ہیں۔ یہ گھناؤنا کاروبار اس قدر چوری چھپے کیا جاتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کتنے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں، لیکن انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن نے اندازہ لگایا ہے کہ سات لاکھ سے چالیس لاکھ تک انسان ہر سال بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار پہنچائے جاتے ہیں۔‘‘

انسانوں کی تجارت قدیم دور سے جاری ہے اور ہر زمانے میں اس کی کوئی نہ کوئی شکل موجود رہی ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی یہ سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے حضرت زید بن حارثہ اسی انسان فروشی کے باعث غلام بنے تھے اور فروخت ہوتے ہوتے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت غلامی تک پہنچے تھے، مگر آپ نے انھیں آزاد کر کے منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ حضرت سلمان فارسی بھی اسی بردہ فروشی کا شکار ہوئے اور فروخت ہوتے ہوتے مدینہ منورہ کے ایک یہودی خاندان کی غلامی میں آ گئے۔ آزاد افراد اور انسانوں کو زبردستی پکڑ کر غلام بنا لینے کا یہ رواج اس دور میں عام تھا اور طاقت ور لوگ جہاں موقع ملتا، طاقت کا یہ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم بد کے خاتمے کا اعلان فرمایا اور حکم صادر کیا کہ آج کے بعد کسی آزاد انسان کو فروخت نہیں کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ آزاد انسان کی خرید وفروخت اور آزاد انسان کو بیچ کر حاصل کی جانے والی کمائی حرام ہے جس پر مسلم دنیا میں آزاد انسانوں کی یہ خرید وفروخت جسے بردہ فروشی کے نام سے پکارا جاتا ہے، ممنوع قرار پائی اور اس کا عملاً خاتمہ ہو گیا، البتہ جنگی قیدیوں کی غلام اور باندی کے طور پر خرید وفروخت کا سلسلہ جاری رہا جس کی صورت یہ تھی کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ انھیں آزاد کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہو سکیں تو انھیں مستقل قیدی بنا لیا جائے، مگر قید خانوں میں ڈالنے کی بجائے خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے جن کی حیثیت غلام اور باندی کی ہو گی۔

ان کی یہ حیثیت کم وبیش آج کے دور کی اس صورت سے ملتی جلتی ہے جس میں کچھ قیدیوں کو ان کی رہائی سے کچھ

عرصہ پہلے پیرول پر رہا کر کے زمیندار خاندانوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور وہ کچھ عرصہ ان کے ہاں پابند انسانوں کی طرح ان کی خدمت کرتے ہیں، چنانچہ اسلام نے اس طرح بردہ فروشی کا تو مکمل طور پر خاتمہ کر دیا، مگر جنگی قیدیوں کے بارے میں ایک آپشن کے طور پر غلامی کا یہ سلسلہ باقی رہنے دیا اور اس کے لیے ایسے احکام وقوانین وضع کیے کہ ان کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ان کے رہن سہن اور ان کے ساتھ سلوک کے ایسے قواعد طے کیے جن سے آزادی اور غلامی کے درمیان فاصلے کم ہوتے چلے گئے۔

غلامی کی یہ محدود سی صورت جو جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم کے طور پر نہیں، بلکہ ایک آپشن کے طور پر باقی رہی، مغرب کے نزدیک ہمیشہ قابل اعتراض رہی اور اسلام پر کیے جانے والے بڑے اعتراضات میں یہ بھی ایک اہم ترین موضوع رہا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اعتراض اس دور میں بھی شد ومد کے ساتھ وارد ہوتا تھا جب خود مغرب، خصوصاً امریکہ میں آزاد انسانوں کی خرید وفروخت کا دھندا عروج پر تھا اور مویشیوں کی طرح انسانوں کی بھی منڈیاں لگتی تھیں جن میں افریقہ سے انسانوں کے بحری جہاز بھر بھر کر لائے جاتے تھے اور جانوروں کی طرح ان کی خرید وفروخت ہوتی تھی، حتیٰ کہ امریکہ کی شہرۂ آفاق خانہ جنگی جو شمال اور جنوب کی جنگ کے نام سے معروف ہے، اس میں آزاد انسانوں کی اس خرید وفروخت کا مسئلہ بھی وجہ نزاع تھا۔ اس دور میں امریکہ کے جنوب کے دانش وروں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جو اس غلامی اور انسانی خرید وفروخت کے حق میں دلائل پیش کیا کرتی تھی جبکہ اسلام اس سے ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل آزاد انسانوں کی اس خرید وفروخت کے خاتمے کا اعلان کر چکا تھا۔

مغرب آج اس بات کو فخر کے طور پر پیش کرتا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کے نام سے انسانوں کی خرید وفروخت کا خاتمہ کیا ہے اور غلامی کی تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، لیکن اقوام متحدہ کی رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور شکل بدل کر، بلکہ کیموفلاج ہو کر انسانوں کی خرید وفروخت کا یہ مکروہ دھندا اب بھی جاری ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اخلاقیات ووجدانیات اور روحانیات سے عاری مادہ پرستانہ فلسفہ حیات میں اس قسم کے جرائم کا خاتمہ ممکن ہی نہیں ہے اور مغرب کو زندگی کے ہر شعبے میں اس کا مسلسل سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری وجہ مغرب کا دوہرا معیار ہے کہ اس نے اپنے لیے الگ معیار رکھا ہے اور مشرقی اقوام اور مسلم ممالک کے لیے اس کا معیار الگ ہے۔ اسی طرح وہ افراد کی آزادی اور حقوق کی دہائی تو دیتا ہے، مگر قوموں کی آزادی اور حقوق کو خود مسلسل پامال کیے جا رہا ہے جس پر مجرموں کے یہ منظم گروہ سوچتے ہیں کہ اگر قوموں کو غلام بنا کر بیچا جا سکتا ہے تو افراد کو غلام بنانے میں آخر کیا حرج ہے؟

سیلاب کی تباہ کاریاں اور ہماری دینی وقومی ذمہ داری

سیلاب کی شدت اور تباہ کاریوں کے بارے میں اس کے بعد مزید کچھ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ اسے گزشتہ ایک صدی کے دوران آنے والا سب سے بڑا اور تباہ کن سیلاب بتایا جاتا ہے اور اقوام متحدہ کے ذرائع کا کہنا ہے کہ سونامی سے ہونے والی تباہ کاری سے اس سیلاب کی تباہ کاریوں کا دائرۂ زیادہ وسیع ہے۔ سیلاب کے اسباب میں

اس بات پر تو کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اوران قدرتی آفات میں سے ہے جنھیں روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، البتہ اس کے نقصانات کو کم سے کم تک محدود کرنے کے لیے تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور بہت سے دوستوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں ان نقصانات کو کم کرنے کے لیے جو تدابیر اختیار کی جانی چاہییں تھیں یا اختیار کی جا سکتی تھیں، وہ بروقت اختیار نہیں کی گئیں۔ لیکن اسباب سے آگے مسبب الاسباب کی طرف کم لوگوں کی توجہ جا رہی ہے جو ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ چند سال قبل آزاد کشمیر میں خوفناک زلزلہ کے موقع پر میں نے بعض زلزلہ زدہ علاقوں میں حاضری دی تو آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار محمد عبد القیوم خان کے پاس بھی تعزیت کے لیے گیا۔ انھوں نے پرنم آنکھوں کے ساتھ زلزلہ سے پیدا ہونے والی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس بات کا زیادہ دکھ اور غم ہے کہ خوف ناک زلزلے اور اس کے نتیجے میں اتنی بڑی تباہی کے باوجود عمومی سطح پر اپنے گناہوں سے استغفار اور رجوع الی اللہ کی کوئی فضا دیکھنے میں نہیں آ رہی اور اس ماحول میں بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے بے پروائی، تعیش اور چھینا جھپٹی کا دور دورہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی صورت حال اسی طرح کی ہے جو اہل نظر اور ارباب بصیرت کی خصوصی توجہ کی طلب گار ہے۔

بہر حال سیلاب زدہ بھائیوں کی ہر طرح سے مدد کرنا ہمارا دینی اور قومی فریضہ ہے۔ ان کی بحالی اور دوبارہ آبادکاری کے منصوبوں میں تعاون کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور مجھے مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا مفتی ولی خان المظفر اور دیگر علمائے کرام کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ نفلی حج اور عمرہ سے سیلاب زدگان کی امداد مقدم ہے اور اس کا اجر وثواب زیادہ ہے۔ ہمیں اپنی ترجیحات میں ایک عرصہ تک سیلاب زدہ بھائیوں کی آبادکاری اور بحالی کے کاموں کو اولیت دینا ہوگی، مگر اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی قومی کوتاہیوں، اجتماعی گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اسباب کے حوالے سے اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات پر نظر ثانی کریں، توبہ واستغفار کا اہتمام کریں، قرآن وسنت کی طرف واپسی کا راستہ اختیار کریں اور انابت الی اللہ کا عمومی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

سیلاب زدگان کی امداد کے لیے مختلف محکموں، اداروں اور این جی اوز کی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک اور سوال بھی زیر بحث ہے کہ متاثرہ علاقوں میں عملاً امدادی کام کرنے والے گروپوں میں وہ گروپ زیادہ سرگرم دکھائی دے رہے ہیں جنھیں انتہا پسند کہا جاتا ہے اور کسی بھی حوالے سے ان کی معاشرتی سرگرمیوں کو عالمی سطح پر پسند نہیں کیا جاتا۔ ہزارہ اور کشمیر کے زلزلے کے موقع پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ مذہبی جذبے سے کام کریں گے اور دنیا سے کسی ستائش کی طلب کی بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقصد قرار دیں گے، ان کا کام بے لوث بھی ہوگا اور عملی طور پر زیادہ اور موثر بھی ہوگا۔ پاکستان میں امریکہ کی سفیر محترم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ انتہا پسند گروپوں کی امدادی سرگرمیوں پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ اس بات پر تشویش ہے کہ انھیں نمایاں زیادہ کیا جا رہا ہے۔ گویا صاحب بہادر کی خواہش یہ ہے کہ انتہا پسند گروپ کام تو کریں، خرچ بھی کریں، وقت بھی صرف کریں اور شب وروز محنت بھی کریں مگر ان کا میڈیا پر تذکرہ نہ ہو اور انھیں نمایاں نہ کیا جائے۔ خدا جانے اعتراض اور کسے کہتے ہیں؟

ڈاکٹر محمد شہباز منج*

* شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا۔ drshahbazuos@hotmail.com

سرسید احمد خان کی تفسیری تجدد پسندی۔ ایک مطالعہ (۳)

قصصِ قرآنی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بعض مقامات پر انتہائی عجیب وغریب اور دوراز کار تاویلات سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید، بقول پروفیسر عزیز احمد، عہد نامہ قدیم و جدید اور قرآن کے عوامی قصص کو ناپائیدار تاریخی مفروضات کا نام دے کر اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مشغول ہو جاتے ہیں۔[۶۹] سورہ الکہف کی تفسیر میں اصحابِ کہف، یاجوج و ماجوج، ذولقرنین اور سدِّ ذولقرنین سے متعلق ان کی طول طویل بحثوں کا ماحصل یہ ہے کہ ایفسوس کے ''سات سونے والے'' اصحابِ کہف تثلیث کے مخالف عیسائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جنہیں دقیانوس بادشاہ نے معتوب کیا تھا۔ وہ فی الواقع کئی سال تک سوتے نہیں رہے تھے بلکہ مر چکے تھے، لیکن جیسا کہ بعض مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ جب لاشیں ایسے مقام پر ہوتی ہیں جہاں ہوا کا گذر نہیں ہوتا، اور وہ اسی طرح رکھے رکھے راکھ ہو جاتی ہیں، اور اگر کسی سوراخ کے ذریعے انہیں سورج کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پورے اجسام بلا کسی نقص کے رکھے ہوئے ہیں، ایسے ہی اصحاب، کہف کی لاشیں بھی دیکھنے والوں کو مجسم معلوم ہوتی ہوں گی، حالانکہ درحقیقت وہاں ہڈیوں اور راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیورس متمس کے مصنف نے لکھا ہے کہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ایک بڑے پتھر کے بکس میں بند کر کے مارسلیس کو بھیجی گئیں جواب بھی سائنٹ وکٹر کے گرجا میں دیکھی جا سکتی ہیں۔[۷۰] ذوالقرنین چینی شہنشاہ چی وانگ ٹی (۲۴۷ ق م) ہے، سدِّ ذوالقرنین وہ گریٹ وال یا دیوارِ چین ہے، جو چی وانگ ٹی نے ۲۳۵ سے ۲۴۰ قبل مسیح کے درمیان بنائی تھی اور یاجوج و ماجوج سے مراد چینی ترکستان کی قومیں ہیں۔ سکندرِ اعظم اور چی وانگ ٹی سے متعلق مسلم قصہ گوؤں نے جو قصے منسوب کر رکھے ہیں، ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرونِ وسطی کے مسلمانوں کے دماغ میں دونوں کی گڈ مڈ تصویریں تھیں۔ سکندر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو اس کا باپ مشہور تھا، اس کا وہ بیٹا نہ تھا، اور یہی بات چی وانگ ٹی کے بارے میں کہی گئی ہے۔ اسی طرح آبِ حیات کی تلاش بھی دونوں بادشاہوں سے منسوب کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رازی جیسے مفسرین نے ذوالقرنین سے سکندرِ اعظم مراد لیا، حالانکہ دراصل اس سے مراد چی وانگ ٹی ہے۔[۷۱]

جہاد

اسلامی جہاد سفلی مقاصد کے لیے لڑی جانے والی عام جنگوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ اعلیٰ انسانی واخلاقی قدروں کے تحفظ و بقا

کے لیے برائی کی قوتوں سے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ اپنے اسی اعلیٰ آدرش کے سبب جہاد کو اسلام میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، اور اسے اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن بھی شمار کیا گیا ہے۔ لیکن مستشرقین نے اسلامی جہاد کو ایسے خوفناک اور گھناؤنے تصور کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جس سے اسلام ظلم وتشدد اور جور وجبر کا مذہب نظر آنے لگے۔ جارج سیل نے ترقی واشاعتِ اسلام کو تلوار پر منحصر بتایا۔۷۲ میئیز۷۳، ولاسٹن۷۴، ٹارانڈرائے۷۵ اور انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے جہاد کا اسلامی تصور پیش کرنے والے مقالہ نگار۷۶ نے بھی، جارج سیل ہی کا راگ الاپتے ہوئے اسلام کو تلوار کا مذہب اور جہاد کو تلوار کے زور پر اسلام نافذ کرنے کا وسیلہ باور کرانے کی سعی کی ہے۔ سرسید احمد خاں نے مغربی اثرات کے زیراثر جہاد سے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرلیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن کے مقالہ نگار کے بقول، سرسید نے روایتی تعبیرات سے انکار کرتے ہوئے جہاد کی ایسی تشریح کرنے کی کوشش کی جو ہندوستان پر قابض انگریزوں کے لیے ناگواریٔ خاطر کا باعث نہ بنے اور تاج برطانیہ کو باور کرایا جائے کہ جہاد کا اسلامی تصور اہل اسلام کو اپنے انگریز حاکموں کا وفادار رہنے سے نہیں روکتا۔۷۷ سرسید کے، سورہ البقرہ کی آیت ۱۸۶ کی تفسیر میں سامنے آنے والے خیالات کے مطابق، اسلام بلاشبہ دوصورتوں میں تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے؛ ایک یہ کہ کافر اسلام کو مٹانے کی غرض سے، نہ کہ ملکی اغراض کے سبب، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو کسی ملک میں جان و مال کی امان اور مذہبی فرائض کی بجا آوری کی اجازت نہ ہو۔ لیکن یہ اجازت صرف ان مسلمانوں کو ہے جو کسی دوسرے ملک کے باشندے ہوں اور کسی اور ملک کے مظلوم مسلمانوں کو بچانے کے لیے تلوار پکڑیں۔ رہے وہ مسلمان جو کسی ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہوں تو ان پر وہاں خواہ ان کے دین کے سبب ظلم ہو، انہیں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں۔ ان کے پاس صرف دو ہی صورتیں ہیں؛ یا ظلم سہیں یا ہجرت کر جائیں۔۷۸ سرسید کے ہم عصر فکری متبعین نے ان کی معذرت خواہانہ تعبیر پر اضافہ کرتے ہوئے جہاد پر خوب مشقِ ستم کی۔ مولوی چراغ علی نے، جو بقول شیخ محمد اکرام، مذہبی بحثوں میں سرسید کے دستِ راست تھے۷۹، پیغمبر اسلامؐ کے مغازی کو تاریخی حوادث سے تعبیر کرتے ہوئے مخصوص حالات کا نتیجہ اور جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی کو خاص حالات سے متعلق قرار دیا جو بعد میں کسی شرعی نظریہ کی بنیاد قرار نہیں پاسکتیں۔۸۰ اور مرزا غلام احمد قادیانی نے تو آگے بڑھ کر جہاد پر خطِ تنسیخ ہی پھیر ڈالا اور اعلان کر دیا کہ آج سے لڑنا حرام قرار دے دیا گیا ہے، لہٰذا اب جو کوئی دین کا نام لے کر جہاد کرتا اور کافروں کو قتل کرتا ہے، وہ خدا اور سول کا نافرمان ہے۔۸۱

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج ایک مرد کے لیے ایک وقت میں مخصوص شرائط کے ساتھ چار تک شادیاں کرنے کی اجازت پر مبنی قانون ہے جو انسان کے خالق نے اپنی حکمتِ بالغہ سے، انسان کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر قائم کیا ہے۔ مستشرقین نے اس قانون کو بھی غلط رنگ میں پیش کر کے مسلمانوں کو اپنے دین سے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ نامور محقق محمد خلیفہ کے مطابق تعددِ ازواج اسلام کے حوالے سے مستشرقین کے ان بڑے اہداف میں سے ایک ہے جن کے بارے میں مغرب میں خصوصیت کے ساتھ غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔۸۲ سرسید پر تعددِ ازواج کے ضمن میں بھی مغربی اہلِ قلم کے اثرات نمایاں ہیں۔ 'تفسیر القرآن' میں ان اثرات کی عکاسی سورہ النساء کی آیت ۳ کی تشریح میں ہوتی ہے۔ سرسید

نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن درحقیقت یک زوجگی کا اصول رائج کرنا چاہتا ہے اور وہ تعددِ ازدواج کی اجازت صرف اس وقت دیتا ہے جب عقل اور اخلاق وتمدن، بمقتضائے فطرتِ انسانی اور ضروریاتِ تمدنی اس کی اجازت دے، اور خوفِ عدمِ عدل باقی نہ رہے، لیکن یہ ایک ایسی شرط ہے جس کا پورا ہونا مشکل ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کو کسی وقت اور حالت میں بھی خوفِ عدمِ عدل نہ ہو۔۸۳ قانونِ تعددِ ازدواج سے متعلق سرسید کی مذکورہ تعبیر اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس پر جو کڑی شرطیں لگا رہے ہیں، وہ دراصل اسے ناممکن العمل بنا دینے کی خواہش کا شاخسانہ ہیں۔ سرسید کی اس خواہش کی تکمیل ان کے معاصر ہم خیالوں اور عقیدت مندوں میں سے، مولوی چراغ علی اور ممتاز علی نے نہایت واضح اور بے باکانہ انداز میں کی۔ انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قرآن نے تعددِ ازدواج کو عدل سے مشروط کیا ہے اور عدل سے مراد محبت ہے اور مرد کے لیے ایک وقت میں ایک سے زیادہ عورتوں سے محبت میں عدل ممکن نہیں۔ لہٰذا قرآن کا مقصود یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کو نفسیاتی طور پر ناممکن العمل بنا کر بتدریج ختم کر دیا جائے۔ یوں گویا تعددِ ازدواج کو قرآن نے عملاً منسوخ کر دیا ہے۔۸۴

نتیجہ بحث

اوپر کی بحث سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے اسلامی عقائد واحکام کی تعبیر وتشریح میں استشراقی و مغربی فکر سے گہرا تاثر لیا اور اپنی رائے اور قیاس کے زور پر اسلام کا ایسا تصور پیش کرنے کی کوشش کی جو جدید تعلیم یافتہ اور عقلیت پرست مغربی گروہ کے لیے قابل قبول ہو۔ سرسید سے تمام تر حسنِ ظن رکھ لینے کے باوصف یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی تاویلات سے ایک فتنے کا دروازہ کھول دیا اور بقول شیخ محمد اکرام، اپنی رائے اور قیاس کے زور پر قرآنی آیات کو نیا مفہوم دے کر ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کی بعض لوگوں نے بری طرح پیروی کی اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کر کے حسبِ خواہش معنی مراد لیے جانے لگے۔ یورپ سے کوئی بھی آواز اٹھے، لوگ فوراً یہ کہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ اس طریقے سے نہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں اسلام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جن کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے نئے علم کلام کی ضرورت بتائی جاتی ہے، بلکہ خود اپنے ہم قوموں میں بھی نیک وبد اور موزوں وغیر موزوں کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ایمان ویقین سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں مذہب ایک کھلونا بن جاتا ہے۔۸۵ دینی عقائد واحکام کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے سرسید کی یہی وہ جسارت ہے، جس نے بعض حلقوں میں ان کے خلاف زبردست بیزاری وبرہمی پیدا کر دی۔ سید جمال الدین افغانی سرسید کے علم کلام کو کفر وبدعت اور ان کی جدید تعبیراتِ قرانی کو الفاظِ قرآنی کی تکذیب پر محمول کیا کرتے تھے۔ پروفیسر عزیز احمد کے الفاظ میں:

" Al-Afghani did not agree with the extremist rationalism of at least Sayyid Ahmad Khan's views, and regarded his new Ilmal-klam some of as a heresy so for as it seemed to falsify the words of the Quran."

یہی نہیں بلکہ بلجن کے مطابق تو افغانی سرسید کو انگریزوں کا آلۂ کار قرار دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ انگریزوں کو سرسید کی صورت میں، اہل اسلام کے اخلاق اور نظم کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے ایک مفید ہتھیار دستیاب ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے سرسید کی تعریف وتوصیف اور علیگڑھ کالج قائم کرنے میں ان کی مدد سے مقصود یہ تھا کہ اہل ایمان کو اپنے جال میں

پھنسا کر بے ایمان بنایا جا سکے۔ افغانی کے نزدیک سرسید یورپ کے مادہ پرستوں سے شدید تر مادہ پرست تھے، کیونکہ مغربی مادہ پرست اپنے دین سے انحراف کے باوجود اپنی حب الوطنی پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے، جبکہ سرسید نے مادرِ وطن میں غیر ملکی جابرانہ حکومت کو سندِ قبولیت عطا کرنے کی کوشش کی۔ ۸۷؎ افغانی کے ان خیالات کو بلا شبہ ان کے رسالے ''العروۃ الوثقیٰ'' میں سرسید سے متعلق مضامین، جن میں بقولِ مولانا ابوالحسن علی ندوی، کسی قدر غلط فہمی اور غلو شامل ہے ۸۸؎، سے ماخوذ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہیں کہ سرسید کم از کم دینی نقطہ نظر سے اہلِ مغرب اور مستشرقین کے آلۂ کار نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی حق میں زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ انہوں نے یہ کام دین کی حمایت کی خوش فہمی میں نادانستہ کیا۔

حوالہ جات وحواشی

۶۹۔ عزیز احمد، پروفیسر، برِ صغیر میں اسلامی جدیدیت، ص ۷۹۔

۷۰۔ سرسید احمد خاں، تفسیر القرآن، حصہ ہفتم، ص ۷۔ ۳۷۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۷۸۔ ۱۰۶۔

۷۲۔ Sale, George, The Quran, p.38.

۷۳۔ Menezez, F.J.L, The life and Religion of Muhammad, the Prophet of Arabian Sands, London, 1911, pp.63,165.

۷۴۔ Wollaston, A.N, The Religion of Islam, Lahore, Sh.Muhammad Ashraf, 1905, p.27

۷۵۔ Tor Andrae, Muhammad, the man and his faith, translated from German by Theophil Menzel, London, George Allen $ Unwin, 1965, p.147

۷۶۔ The Encyclopedia Americana, Op.Cit.Vol.16,pp.91-92

۷۷۔ The Encyclopedia of Religion, Op.Cit.Vol.8,pp.90-91.

۷۸۔ سرسید احمد خاں، تفسیر القرآن مع اصول تفسیر، ص ۳۱۳۔ ۳۱۵۔

۷۹۔ محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ص ۱۶۶۔

۸۰۔ چراغ علی، تحقیق الجہاد، حیدر آباد، س۔ ن، ص ۱۔ ۱۲۔

۸۱۔ قادیانی، غلام احمد، مرزا، اشتہار، ۲۸ مئی ۱۹۰۰ء۔

۸۲۔ Muhammad Khalifa, The Sublime Quran and Orientalism, Op.Cit.p.178.

مولانا شیخ رشید الحق خان عابد

آفتابِ معرفت

شیخ المشائخ حضرت خواجہ خان محمدؒ

رفتم وازرفتنِ من عالمے تاریک شد   من مگر شمسم چوں رفتم بزم برہم ساختم

آنحضرت جل سلطانہ کی خلاقی وصناعی کا کیا کہیے کہ اس نے باوجود قدرتِ تامہ کے اپنی حکمتِ بالغہ سے نوع بنی آدم کو مختلف الاستعداد والحیثیۃ بنایا، جس کو خبیث النفس اور مبغوض جانا؛ اس کو کفر وشرک اور بُعد کی تاریکیوں میں دھکیل دیا، یا خلق کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی کی قعرِ مذلت میں گرا کر لعنتوں کا مستحق ٹھہرایا اور "نُولّہ ماتولّی" کی سزا سنائی اور جس کو شریف النفس پایا؛ اس کو پسند فرما کر ایمان وعمل صالح کے اَنوار سے مزین فرمایا اور جس کو مقعدِ صدق کے لائق پایا، اُس کو اپنے در پہ بٹھا کر قرب ومعرفت اور لذت آشنائی بخشی۔ پھر لھم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ کی نوید سنائی۔ فالحمد لمن قدّر خیراً و خبالاً۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے   جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

پھر بخاطرِ مصلحت اپنے نظامِ خیر وشر کی کشاکش کو تا قیامت جاری رکھنے کے لیے ہر دور میں، ہر استعداد کے مظاہرِ خیر وشر پیدا فرمائے۔ اگر ایک طرف مظاہرِ خیر میں اصحابِ صفا پیدا فرمائے، تو مظاہرِ شر میں اصحابِ کدورت ظاہر فرمائے۔ اگر اِدھر فنا فی اللہ کے حامل پیدا فرمائے، تو اُدھر فنا فی الشیطان ظاہر فرمائے۔ اگر مظاہرِ خیر میں استعداد عالی کی بنا پر اِنسلاخ عن الشر کو وجود بخشا تو مظاہرِ شر میں اِنسلاخ عن الخیر سے نظام جاری رکھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز   چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

گویا کہ ہر زمانے میں لکل فرعون موسیٰ کا اصول جاری رہا۔ چنانچہ آخری دور میں مہدی اور دجال اسی اِنسلاخ عن المادۃ کے مظاہر ہوں گے۔ اَلفِ ثانی میں حضرتِ حق جل مجدہٗ نے دینِ اکبری کو بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی براہ راست تربیت فرما کر اُن کو اپنے قرب ومعرفت کے انتہائی اعلیٰ مراتب عنایت فرمائے جو بڑے بڑے اکابر مشائخ امت کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے اور کم ترك الأوّل للآخر کا مصداق بنے۔ نسبتِ مجدّدیہ انہی مراتب سے عبارت ہے۔ پھر آنحضرت جل سلطانہ نے اس نسبتِ مجددیہ کی چوٹیوں پر فائز ہونے کے لیے جن چند برگزیدہ شخصیات کو منتخب فرمایا، اس آخری دور میں انہی میں سے قیّومِ زمان اعلیٰحضرت خواجہ ابوالسعد احمد خان قدس سرہ

بانی خانقاہ سراجیہ کی ذات گرامی تھی۔ حضرت حق جل مجدہٗ جب کسی کو نوازنے کا ارادہ فرماتے ہیں، تو خلقِ اسباب و رفعِ موانع بھی خود فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ امامِ وقت شہنشاہِ معرفت مخدوم العلماء والمشائخ خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ قدس سرہ کی تربیت کے لیے اعلیٰ حضرت قیوم زمان کو ان کے ہاں بھجوایا۔

پھر ان کی نگرانی میں اعلیٰ علم وعمل سے نوازا۔ پھر حضرت ثانی قدس سرہ کی تربیت میں عین جوانی میں نسبتِ مجدّدیہ کی بلندیوں سے سرفراز فرمایا اور پھر کم وبیش پچاس سال سے زائد عرصہ تک شہنشاہِ معرفت اور امام ہونے کا شرف بخشا! حق یہ ہے کہ اتنی بڑی سعادتیں امت میں خال خال ہی کسی کو نصیب ہوئی ہیں۔ ولی را ولی می شناسد کے ضابطہ کے تحت اگر چہ کسی ادنیٰ ولی کو بھی ولی کے بغیر دوسرا نہیں پہچان سکتا، چہ جائیکہ امامِ وقت کو کوئی پہچانے، خصوصاً جبکہ اعلیٰ ظرفی، خاموشیٔ طبع اور اِخفاءِ حال کی بنا پر امتیازی تعلّی ورسمی بہتری کا بھی دور پار تک کوئی شائبہ نہ ہو۔ حق یہ ہے کہ اس پچاس سال کے عرصہ میں انہی وجوہ کی بنا پر بڑے بڑے اکابرِ علم واساطینِ روحانیت میں سے شاید ہی کسی نے حضرت کی ذاتِ عالی کو کماحقہا پہچانا ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کسی کے مقاماتِ قرب کا علم ہی کسی کو نہ ہو تو ان تک رسائی کا علم کسی کو کیسے ہو سکے گا؟! چنانچہ ایک دفعہ اس نادان نے جرأت کرتے ہوئے حضرت خواجہؒ سے عرض کر ہی دی: کہ معتقدین میں سے شاید ہی کوئی آنحضور کی بلندیٔ مرتبت کو جانتا ہو، حضرت نے مسکرا کر فرمایا: ''آپ کی بہت مہربانی''۔

راقم الحروف سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ میں شیخ المشائخ حضرت شیخ سید صفی اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کا مرید، تربیت یافتہ اور خاتم الخلفاء ہے؛ جو کہ فاضل دیوبند تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے شاگردِ خاص اور شیخ العرب والعجم مولانا عبد الغفور مدنیؒ کے سات سلاسل میں خلیفہ اَجل تھے۔ اپنی وضع قطع، بود وباش اور ریاضت کے اعتبار سے اکابر مشائخ متقدمین کا کامل نمونہ تھے اور یہ نادان سلسلہ مجددیہ بنّوریہ میں شیخ المشائخ خواجہ مظفر الدین سید پوری قدس سرہ اور خواجہ محمد سعید کوہستانی قدس سرہ کا خلیفہ ہے۔ دونوں حضرات قطب وقت خواجہ شمس الدین سید پوری بنوری قدس سرہ کے خلفاء تھے، جبکہ اوّل الذکر صاحبزادے بھی تھے۔ دونوں نے تقریباً سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ دونوں حضرات مجھ کم نصیب پر بہت ہی مہربان تھے۔ اوّل الذکر کی سو سالہ زندگی کا سب سے چہیتا خلیفہ اور ثانی الذکر کی سو سالہ زندگی کا واحد خلیفہ ہونے کا شرف حضرتِ حق نے عنایت فرمایا! میرے اس بنوری سلسلے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نالائق کی معلومات کے مطابق عالم اسلام میں پھیلے ہوئے مجددی سلاسل میں سب سے عالی سند سلسلہ ہے۔ باوجود بلندیٔ مرتبت کے حضرت خواجہؒ اور امام ربانیؒ کے درمیان بارہ یا تیرہ واسطے ہیں، جبکہ مجھ نالائق اور امام ربانیؒ کے درمیان صرف نو واسطے ہیں۔ سند کا عالی ہونا علومِ ظاہرہ میں خصوصاً فنِ حدیث میں اگر چہ بہت اہمیت کا حامل ہے، لیکن فنِ تصوف میں جس کا مدار بلندیٔ قرب ومرتبت پر ہے، سند کا عالی ہونا زیادہ سے زیادہ فی الجملہ اہمیت رکھتا ہے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

حضرت خواجہؒ کے ساتھ مجھ نالائق کو بچپن سے ہی اعتقاد تھا۔ معلوم نہیں کہ عالم اسباب میں اس کی وجہ کیا بنی تھی؟! لیکن بندہ کے برادر کبیر قاری محمد اشرف خان ماجد (مرحوم) کے حضرت خواجہؒ سے بیعت کرنے پر اس اعتقاد کو مزید تقویت ملی۔ لیکن باضابطہ استفادے کا موقع مندرجہ بالا مشائخؒ سے ہی ملا۔ آخر عمر میں حضرت خواجہؒ سے خط وکتابت بھی چند بار ہوئی اور زیارت اور صحبت شریفہ میں حاضری کی سعادت بھی چند بار ملی اور علمی وروحانی استفادے کا موقع بھی نصیب ہوا۔ آٹھ،

دس بار حضرت نے شفقت فرماتے ہوئے تنہائی میں نجی ملاقات کا موقع بھی عنایت فرمایا اور چند بار مختلف مواقع و مقامات میں مجامع میں ملاقات کا موقع بھی ملا۔ نظر کشفی سے بندہ کی روحانیت وحقیقت کو دیکھتے ہوئے اسباق کی نشاندہی اور راہنمائی بھی فرماتے رہے۔ ماوشما کے لیے جس شخصیت کا تعارف ہی ناممکن ہو اس کے بارے میں مجھ بے بضاعت کا کچھ ذکر کرنا اگرچہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا لیکن:

ما تماشا کنانِ کوتہ دست تو درختِ بلند وبالائی

کا اعتراف کرتے ہوئے یہ نادان صحبت شریفہ میں اخذ کردہ، چند علمی و روحانی فیوض و برکات کا ذکر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگرچہ اس سے حضرت کے کسی ادنی کمال کی عکاسی بھی نہیں ہو سکے گی۔

ہزار بار بشویم دَہن زمشک وگلاب ہنوز نامِ تُو گفتن کمال بے ادبی است

بلندئ مرتبت

آنحضرت جل سلطانہ نے امامِ وقت حضرت خواجہؒ کو تمام کمالاتِ ظاہری و باطنی، علمی، عملی و روحانی سے بھرپور نوازا تھا۔ بندہ نے اپنی حیات میں جن اکابر علماء ومشائخ کی زیارت کی؛ کسی کو بھی جامعیت کمالاتِ ثلٰثہ میں حضرت خواجہؒ کے برابر نہیں پایا۔ خاص طور پر فنِ تصوف کے تمام لوازم وآثار کا حامل، نیز بیعت، معرفت وحقیقت کے رموز واسرار کا پورا پورا آشنا حضرت عالی کے ہم پلہ کوئی شخص عالم اسباب میں قریب قریب ناممکن تھا۔ اوائل شباب میں اپنی کم ظرفی و پست ھمتی کی بنا پر بندہ کا خیال تھا، کہ نسبت مجددیہ کے انتہائی اعلیٰ وآخری مراتب، بالخصوص ''کمالات وحقائق'' کے حامل لوگ اس دور میں نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ آج سے اٹھارہ سال قبل حضرت کے سامنے حضرت کے اسی مکتوب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو آخر میں درج کیا جائے گا، بندہ نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو مسکرا کر فرمایا: ''کہ تمہارا خیال درست نہیں، بلکہ اس نسبت کے حامل لوگ اس دور میں بھی موجود ہیں''۔ چنانچہ بندہ نے استشہاد کے طور پر امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے معاصر مرزا مظہر جانجاناںؒ کا قول نقل کیا کہ انہوں نے اپنے آخری دور میں سالکین کی سست روی کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا کہ عنقریب کمالات کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ولایت کا کھلا رہے گا، حقائق تک رسائی تو بہت متعذر رہے۔

لگے ہاتھوں حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا تعارف بھی کراتا چلوں کہ مرزا صاحبؒ کس پائے کی شخصیت تھے؟! امام الہند شاہ ولی اللہؒ جیسی نابغہ روزگار شخصیت، جو اپنی اعلیٰ ظرفی اور عالی نفسی کی بنا پر بہت کم کسی کی معتقد تھی اور حسب عادت بہت کم کسی کے لیے تعریفی کلمات فرمائے ہیں، لیکن باوجود مرزا صاحبؒ کے معاصر ہونے کے شاہ صاحبؒ کا فرمان ہے:

''اللہ پاک نے مجھے اتنا اعلیٰ کشفِ صحیح عنایت فرمایا کہ کسی وقت پوری دنیا میرے سامنے ایسے منکشف ہوتی ہے جیسے ہاتھوں کی لکیریں۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی کسی اقلیم میں مرزا صاحبؒ جیسی شخصیت موجود نہیں۔ وہ قیم طریقہ احمدیہ ہیں۔ جو بھی نسبت مجددیہ کی تحصیل چاہتا ہو، اپنے آپ کو مرزا صاحبؒ تک پہنچائے''۔

بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اتنی بلند شخصیات متقدمین میں بھی خال خال ہوئی ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے بندہ سے مرزا صاحبؒ کا قول سن کر فرمایا کہ اس سے مرزا صاحبؒ نے اپنی وفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بندہ نے عرض کی: کہ ''کمالات و حقائق'' کا دروازہ بند ہونے سے اگرچہ وفات کی طرف اشارہ ممکن ہے، لیکن ''ولایات کا دروازہ کھلا رہے گا'' سے نسبت

کے تنزل پذیر ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ حضرت خواجہ مسکرا کر قدرے خاموش رہے؛ پھر فرمایا کہ مقاماتِ ''کمالات و حقائق'' کے قوۃ وضعف میں فرق ممکن ہے، ورنہ نفس کمالات حقائق اس دور میں بھی حاصل ہیں۔

تو وطوبیٰ وما وقامتِ یار فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

قارئین کو معلوم رہے کہ مقامات کمالات وحقائق آنحضرت جل سلطانہ کے قرب کے انتہائی مقامات میں سے ہیں جن سے بالاصالتہ تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰات والتسلیمات ہی بہرہ ور ہوتے ہیں، لیکن امتیوں میں سے بھی گنے چنے افراد انتہائی اعلیٰ استعداد اور انتہائی اعلیٰ متابعت کی بنا پر فیضیاب ہوتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ سالک جس نبی کے زیرِ قدم ہوتا ہے، اس کی حقیقت سے متحد ہونے کے بعد حضرت حق کی طرف سے اپنے ساتھ وہی معاملات پاتا ہے جو اس نبی علیہ السلام نے پائے اور بغیر کسی وساطت کے براہِ راست حضرت حق جل مجدہ سے مستفیض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دور حاضر کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ سعادت ہے جس کا مندرجہ بالا مکالمہ میں در پردہ حضرت خواجہؒ نے اعتراف فرمایا؛ اور حق یہ ہے کہ یہ نعمت نسبت ولایت سے بالاتر ہے۔ ''کمالات نبوت اور نسبت مجددیہ'' کے خصائص میں سے ہے۔

بے نفسی

دین و دنیا کی کوئی نعمت بھی جب حضرتِ حق جل شانہ کی طرف سے کسی کو عنایت ہوتی ہے؛ خاص طور پر جب کوئی بڑا منصب مل جائے تو جب تک منعم علیہ بہت اعلیٰ ظرف اور وسیع الصدر نہ ہو، تب تک بڑوں بڑوں سے بھی خودنمائی کا عنصر ضرور شامل ہو جاتا ہے، لیکن حضرت خواجہؒ اس سلسلے میں بہت اعلیٰ ظرف واقع ہوئے تھے۔ بارہا بار بندہ نے مختلف حیلوں بہانوں سے کریدنے کی کوشش کی لیکن کیا مجال ہے کہ کبھی خودرائی کا اظہار ہو۔ جیسے کہ آئندہ آنے والے مکتوبات سے بھی معلوم ہوگا۔ حضرت خواجہ کو آنحضرت جل سلطانہ نے مسلسل پینسٹھ (۶۵) حج ارزانی فرمائے تھے جو کہ ایک نایاب یا کمیاب سعادت ہے!! بندہ نے ایک دفعہ عرض کی کہ جیسے حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ معصوم قدس سرہ نے ''یاقوت احمر'' کے نام سے اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے ''فیوض الحرمین'' کے نام سے اور دیگر اکابر نے مختلف ناموں سے حرمین شریفین میں پیش آمدہ معاملات، فیوضات و برکات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ آپ نے تو بہت زیادہ بار حاضری دے کر فیوض و برکات حاصل فرمائے ہیں۔ آپ بھی کچھ تحریر فرماتے ؟! برجستہ فرمایا'' کہ مجھے کوئی دعویٰ نہیں، بندہ نے جرأت سے عرض کی: کہ میں دعویٰ کا نہیں عرض کر رہا، بلکہ یہ کہ خلقِ خدا کو اس سے بہت سی معلومات اور استفادہ ہوتا؟ فرمایا کہ کوئی ضرورت نہیں!

اللہ اکبر! کہاں حضرت خواجہؒ جیسے خدا رسیدہ مرشدانِ حقیقی اور کہاں میرے جیسے نالائق رسمی اور نمائشی پیر۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! اسی ضمن میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ قطبِ وقت خواجہ شمس الدین سید پوری بنوری قدس سرہ کے ایک خلیفہ ریل گاڑی کے سفر میں تھے۔ ایک کحیم شحیم رسمی پیر صاحب بڑے طمطراق سے چار آدمیوں کی سیٹ پر قبضہ کر کے ایسے ہی براجمان تھے۔ خلیفہ صاحب اسی سیٹ کے ایک کونے پر مشکل اڑ کر بیٹھ گئے اور بار بار پیر صاحب کی طرف لجاجت آمیز نظروں سے دیکھا کہ میں تنگ بیٹھا ہوں؛ شاید پیر صاحب تھوڑا سمٹ کر میرے لیے کچھ گنجائش پیدا کریں۔ لیکن پیر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ ہی خلیفہ صاحب کی روحانیت کو پرکھ سکے۔ آخر خلیفہ صاحب نے عرض کر دی: کہ حضور! اگر تھوڑا اکلوز ہو جائیں تو میرے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ پیر صاحب جو کہ کافی دیر سے خودنمائی کے لیے پر تول رہے تھے لیکن موقع نہیں مل رہا تھا

؛فوراً غصے سے گردن کو خاص انداز میں تاؤ دے کر بولے: آپ کو معلوم ہے کہ میرے چار لاکھ مرید ہیں؟! خلیفہ صاحب نے عرض کی: کہ حضور میں نے تو مریدوں کی تعداد پوچھی بھی نہیں، نہ ہی اس سے میری کوئی غرض ہے کہ مجھے تو بیٹھنے کے لیے ڈیڑھ فٹ جگہ چاہیے!! ظاہر ہے کہ ایسے خود نما پیروں سے کس کی کیا اصلاح ہوگی؟!

یہ زاہد نفس پرور تیرے دربان بن کے بیٹھے ہیں خداوند تیرے در تک رسائی کتنی مشکل ہے

کشف وکرامات

کشف وکرامات اگرچہ ولایت کی شرط نہیں؛ لیکن کم وبیش صوفیانہ ولایت کے لوازم وآثار میں سے ہے۔ طریق تصوف میں آنحضرت جل سلطانہ کا شاید ہی کوئی ایسا پاک باطن برگزیدہ بندہ ہو جو کم وبیش اس سے خالی ہو۔ خواہ وہ خود سمجھے یا نہ سمجھے۔ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ جن کی سجادگی کا زمانہ چوّن سالہ (۵۴) طویل عرصہ پہ محیط ہے۔ لاکھوں مریدین اور متوسلین حضرت خواجہؒ سے فیض یاب ہوئے۔ ہزاروں معتقدین نے موقع بموقع ان سے کشف وکرامات کا صدور دیکھا جو کہ معتقدین میں ہر خاص وعام کی زبان پر ہیں۔ راقم الحروف اپنے ساتھ پیش آمدہ دو واقعاتِ کشف کا ذکر کرے گا:

پہلا واقعہ: خانقاہ شریف میں گرمیوں میں عصر کی مجلس میں بندہ بھی حاضر تھا۔ حضرت کے حجرہ شریفہ اور مسجد کے صحن کے درمیان کھلی فضا میں مجلس ہوتی تھی۔ حضرت چارپائی پر تشریف فرما تھے اور چند معتقدین حضور کا بدن مبارک دبا رہے تھے۔ بندہ بھی آہستہ آہستہ قریب پہنچا دبانے والے ساتھی نے حضرت کا بازو اس انداز سے تھام رکھا تھا، کہ دست مبارک مجھے نظر آرہا تھا؛ بندہ چونکہ پامسٹری کا شوق بھی رکھتا تھا۔ خیال ہوا کہ حضرت کے دست مبارک میں کونسی ایسی لکیر ہے جو حضرت کے امامِ وقت ہونے پر دال ہے؛ دیکھنا چاہیے۔ بندہ نے غیر محسوس طریقے سے مزید قریب ہونے کی کوشش کی۔ حضرت نے مکشوف ہونے پر فوراً لطیف حیلے سے دست مبارک کا رخ اپنی طرف فرما کر مٹھی بند کرلی اور دو، تین بار بندہ کی طرف خاص نظروں سے دیکھا اور آخر تک مٹھی بند ہی رکھی۔

دوسرا واقعہ: حضرت خواجہ اپنی افتادِ طبع اور خاموشی کی بنا پر بوقت ملاقات عام طور پر رسمی علیک سلیک پر ہی اکتفا فرماتے تھے۔ بہت ہی اخص الخواص حضرات سے معمول سے زائد انبساط بھی کبھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت اسلام آباد تشریف لائے ہوئے تھے۔ بندہ حاضر ہوا۔ گھر کے کسی بچے نے بتایا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ چنانچہ بندہ نے باہر گلی میں ہی چہل قدمی میں بہتری سمجھی۔ خیال ہوا کہ اندر مجمع بھی ہوگا، سرسری سی ملاقات ہوسکے گی۔ کاش کہ حضرت خود ہی خلاف معمول کافی انبساط وشفقت فرمائیں! چنانچہ حضرت کے فارغ ہونے پر بندہ حاضر ہوا۔ حضرت نے بوقت سلام خلاف معمول بندہ کا ہاتھ کافی دیر تھامے رکھا اور حال احوال پوچھتے رہے۔ بالآخر بندہ اپنے خیال اور خواہش پہ مسکرا دیا۔ حضرت بھی مجھے دیکھ کر مسکرائے اور پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔ اسی طرح میرے علاوہ ہزاروں معتقدین کیساتھ ایسے واقعات بارہا بار پیش آئے ہوں گے جو کہ حضرت کے انتہائی روشن ضمیر ہونے پر دال ہیں۔

حافظہ

محدثین، فقہاء اور علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں حافظے کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور ان کی سوانح میں

اس کا خاص ذکر ملتا ہے۔ جو کہ وہبی اور کسبی دونوں طرح کا ہوسکتا ہے۔ گناہوں سے تحفظ، خصوصی طور پر نظروں کی حفاظت سے اس کا خاص تعلق رہا ہے۔ لیکن عام ضابطے کے برعکس تصوف میں کمال کا مدار چونکہ فنا و بقا پر ہے جو کہ ماسوا کے نسیان پر مرتب ہے۔ اسی لیے صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ میں ایسے ایسے مستغرق الحال لوگ بھی بکثرت ہوئے ہیں جو اپنا نام تک بھول جاتے تھے، لیکن حضرت خواجہؒ باوجود انتہائی اونچے صوفی صافی ہونے کے کمال درجہ کا صحو و بقا بھی رکھتے تھے۔ اس لیے حافظہ بھی بہت قوی رکھتے تھے۔ خانقاہ کی طرف سے ایک بار ''دلائل الخیرات'' طبع ہوئی جس کے شروع میں درودِ تاج بھی طبع ہوا۔ ایک ٹھیٹھ مولویانہ ذہن رکھنے والے ساتھی نے کہا کہ اس میں کچھ الفاظ موہم شرک ہیں! بندہ اتفاق سے اپنی کسی مقصد کے لیے حضرت خواجہ کو خط ارسال کر رہا تھا۔ اس نے بھی یہ اشکال لکھ کر بھیج دیا۔ حضرت خواجہؒ نے جواب میں ''دلائل الخیرات'' کے شروع میں درودِ تاج کی طبع سے لاعلمی اور بے تعلقی ظاہر فرما کر معذرت فرمائی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

اس واقعے سے تین سال بعد بندہ پہلی بار خانقاہ شریف زیارت کے لیے حاضر ہوا تو غالباً دوسرے دن حضرت خواجہؒ نے ایک عبارت بندہ کے سامنے رکھ دی فرمایا کہ اس عبارت پر شرعاً کوئی اشکال تو نہیں؟! بندہ نے عرض کی: کہ اگر ''با'' سببیت کے لیے لیں، علت کے لیے نہ لیں تو بظاہر کوئی اشکال نہیں۔ حضرت نے فوراً مسکرا کر فرمایا کہ پھر لوگ درودِ تاج پر کیوں اعتراض کرتے ہیں!! سچ یہ ہے کہ درودِ تاج والا مندرجہ بالا قصہ بندہ کے اپنے ذہن سے نکل چکا تھا، لیکن حضرت کے فرمانے سے ذہن میں تازہ ہوا اور حضرت کے قوی حافظے کی داد دینی پڑی۔

عشقِ امام ربّانیؒ

اگرچہ مجددی سلسلے کے ہر شاب و شیخ کو امام ربانی سے خصوصی محبت ہوتی ہے لیکن حضرت خواجہؒ کو امام ربانیؒ سے غایت درجہ محبت تھی۔ اتفاق سے ایک بار مجلس میں بندہ نے عرض کی: کہ خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ امام ربانیؒ کے خلیفہ اجل شیخ آدم بنوریؒ کے بعض ملکات، امام ربانیؒ سے زیادہ قوی تھے۔ خلاف معمول سن کر حضرت چیں بجبیں ہوئے اور فرمایا کہ کاشمیری صاحب نے کون سی نسبت مجددیہ حاصل کی ہوئی تھی کہ ان کو یہ کہنے کا حق ہو؟!!

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نماز کے تشہد میں رفع مسبحہ کے قائل نہیں تھے اور ان کے عاشق صادق تمام حاملین نسبتِ مجددیہ بھی اسی نسبت سے رفع مسبحہ نہیں فرماتے تھے۔ حضرت خواجہؒ کا بھی معمول عدم رفع کا تھا۔ اسی طرح رئیس المحدثین حضرت مولانا حسین علیؒ بھی عدم رفع کے قائل تھے۔ امام ربانیؒ نے مکتوبات میں فقہی روایات سے مدلل ایک مکتوب عدم رفع مسبحہ پر بھی تحریر فرمایا ہے۔ ایک دن بندہ نے حضرت خواجہؒ سے عرض کی کہ آپ کے تشہد میں اشارہ نہ فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: کہ تم نے مجدد صاحبؒ کا مکتوب نہیں پڑھا؟ بندہ نے عرض کی کہ بندہ نے مرزا صاحبؒ کا مکتوب بھی پڑھا ہے۔ (مرزا صاحب نے اثبات رفع مسبحہ پر مکتوب تحریر فرمایا ہے اور باوجود مجددی اور عاشق امام ربانی ہونے کے مجدد صاحب کے قول کو فقہی اعتبار سے مرجوح قرار دیا ہے۔) حضرت میرا جواب سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ حضرت مجددؒ کے صاحبزادہ ثانی خواجہ محمد سعیدؒ نے عدم رفع پر ایک مستقل کتاب تحریر فرمائی ہے۔ بندہ نے عرض کی: کہ مجھے امام ربانیؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے خواجہ محمد یحییٰؒ کے اثبات رفع پر مستقل تصنیف کا بھی علم ہے۔ حضرت جواب سن کر محظوظ ہوئے اور مسکراتے رہے۔ آخر میں بندہ نے عرض کی کہ ہماری حنفی فقہی روایات کا سب سے بڑا ماخذ اور سند تو امام محمدؒ ہیں۔ وہ خود

فرمارہے ہیں: "وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفةؒ" کہ ہمارے امام ابوحنیفہؒ کا یہی قول وعمل ہے؛ رفع مسبحہ، اور اسی پر ہمارا عمل ہے تو پھر کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے! حضرت نے مسکرا کر فرمایا: کہ بھئی آپ کیا کریں، آپ کو کون روکتا ہے؟

سکوتِ دائمی

ہر سلسلے کی اپنی خصوصیات ہوا کرتی ہیں سلسلہ نقشبندیہ کی بنا ہی چونکہ ذکر خفی پر ہے۔ اس لیے خاموشی سے صحبتِ شیخ میں اپنے لطائف اور اسباق کی طرف متوجہ رہ کر فیوض و برکات اخذ کرنے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حضرت خواجہؒ اسی اصول کی بنا پر ہمیشہ خاموش رہتے تھے۔ احادیث میں خواجہ کائنات حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کان كثير الصمت کے الفاظ آئے ہیں اور یہ تو قارئین نے سنا ہی ہوگا: کہ حکمت و دانائی کے دس اجزاء ہیں؛ جن میں سے نو صرف خاموشی میں ہیں اور ویسے بھی اصحابِ عشق و معرفت کی خاموشی خالی سکوت کا نام ہی نہیں؛ بلکہ: خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید کا مصداق ہوتی ہے۔ نیز من عرف اللّٰه كلّ لسانه بھی مسلّمات میں سے ہے۔ ان تمام امور کی بنا پر حضرت خواجہؒ دائم السکوت تھے۔ عوام الناس جو کہ جب تک وعظ و نصیحت یا بیان نہ سن لیں متاثر نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس اصول کو نہ سمجھنے والے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی حضرت کی مسلسل خاموشی پہ حیران ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کسی نے عرض کر ہی دی: کہ حضور کچھ فرمائیں؟ تو حضرت خواجہؒ نے امام ربانیؒ کا قول نقل فرمایا:

''جس کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہ ہو، اس کو ہمارا کلام کوئی فائدہ نہیں دے گا''

ایک دفعہ اتفاق سے بندہ خانقاہ میں تھا۔ مظفر گڑھ کے علاقے سے ایک عمر رسیدہ سفید ریش، تقریباً حضرت کے ہم عمر ایک صاحب، بڑے باتونی اور چٹورے قسم کے مرید تشریف لائے۔ غالباً کسی دینی مدرسے کے سفیر بھی تھے۔ مجلس شریفہ میں سوائے علیک سلیک کے کوئی بات بھی نہ سن پائے۔ مجلس کے بعد میرے پاس آ بیٹھے اور فرمانے لگے: کہ حضرت تو بالکل بولتے ہی نہیں!! میرے پہلے شیخ خواجہ سعید گوہانویؒ مجھے بہت نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ بندہ نے عرض کی: کہ اپنی اپنی طبیعت ہے؛ جو بات واقعی ضروری ہو حضرت فرما دیتے ہیں۔ جو نہیں فرماتے وہ ضروری نہیں ہوتی۔ کہنے لگے: کہ میں تو حضرت کی خاموشی سے تھک جاتا ہوں!! حضرت کو کچھ نہ کچھ فرمانا چاہیئے۔ بندہ نے عرض کی: کہ بزرگوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ عصر کی مجلس میں ان صاحب نے حضرت کے کچھ فرمانے کا انتظار کیا لیکن بے سود۔ بالآخر خود ہی بول پڑے کہ: سائیں! میرے پہلے پیر مجھے بہت نصیحتیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی وفات کا وقت آیا تو میں نے عرض کی: کہ آپ تو اب فوت ہو رہے ہیں میرے بارے میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا: کہ میری وفات کے بعد دو آدمیوں میں سے جس کے پاس مرضی ہو چلے جانا: ایک حضرت خواجہ عبداللہ بہلوی شجاع آبادی ہیں اور دوسرے حضرت خواجہ خان محمد کندیاں والے ہیں۔ چنانچہ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ دونوں میں سے کس کے پاس جاؤں؟! تو کچھ عرصہ بعد خواجہ عبداللہ بہلویؒ بھی وفات پاگئے۔ چنانچہ پھر صرف آپ ہی رہ گئے۔ پھر میں آپ سے بیعت ہوا۔ اس بزرگ کی زبان سرائیکی تھی اور حضرت کے ساتھ بات کا طرز بالکل ہم عمر دوستوں جیسا تھا۔ جس سے حضرت خواجہؒ سمیت پوری مجلس کافی محظوظ ہوئی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ سائیں! چند سال پہلے جو مرید آپ کے پاس آتے تھے کافی سخی ہوتے تھے۔ کوئی مٹھائی لے آتا، کوئی پھل لے آتا، مجھے بھی کھانے کا موقع مل جاتا۔ لیکن اب چند دن سے دیکھ رہا ہوں کہ کافی بخیل مرید آتے ہیں، کوئی چیز نہیں لاتے!!

حضرت نے فرمایا: تمہیں مٹھائی کی خواہش ہے، تمہیں مل جائے گی۔ ان صاحب نے حضرت کی بشاشت کو دیکھتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ دستار کافی سال پہلے آپ نے دی تھی؛ اب بالکل بوسیدہ ہو چکی ہے۔ اس دفعہ نئی دستار مجھے عنایت کرو؛ میں لے کر جاؤں گا۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مل جائے گی!''

الغرض مجلس شریفہ میں اگرچہ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہوگی کہ حضرت کچھ فرمائیں، لیکن حضرت اپنے اصول کی پاسداری فرماتے ہوئے، آفتابِ معرفت و مورد تجلیات ہونے کی بنا پر اپنے فیوضات و برکات کی ضیاء پاشیوں سے باطنی طور پر مجلس کو گرم رکھتے تھے۔ جس سے اصحابِ بصیرت واستعداد؛ خصوصاً اصحابِ ادراک وکشف پوری طرح مستفیض ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک ہیئت پر جم کر بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔ انوار ہڈیوں میں سرایت کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

دل سلگتا ہے تیرے سرد رویے پہ مرا دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے

حضرت کی ذات عالی تو نور مجسم تھی۔ مجلس شریفہ سے کسی کے بے فیض اُٹھنے کا تو سوال ہی کیا ہے۔ الّا یہ کہ کوئی بہت ہی شیطان صفت اور خلق کی ایذا رسانی کی بنا پر محروم القسمت ہو تو علیحدہ بات ہے!

تہید ستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل خضر از آبِ حیوان تشنہ لب آرد سکندر را

ورنہ حضرتؒ تو جس علاقے میں تشریف فرما ہوتے؛ پورے علاقے کی فضا انوار کی بارش سے سیراب ہوتی تھی۔

ایک دفعہ بندہ بقر عید کے دوسرے دن قطب البلاد حضرتِ لاہور پہنچا۔ دو دن بعد حسب معمول رات کو سویا تو فضا معمول کے مطابق تھی لیکن سحری کو جب اُٹھا تو لاہور شہر کی فضا کو بندہ نے روحانیت سے معمور پایا۔ بڑی حیرت ہوئی؛ کہ ابھی رات کو خلاف معمول کوئی بات نہیں تھی، اب سحری کو یہ روحانیت کہاں سے آئی۔ فوراً ذہن حضرت خواجہؒ کی طرف منتقل ہوا کہ غالباً رات کے کسی حصے میں حضرت خواجہؒ لاہور میں تشریف فرما ہوئے ہیں۔ چنانچہ صبح فجر کے فوراً بعد ناشتے میں بندہ نے میزبان سے کہا کہ شاید حضرت خواجہؒ لاہور میں تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت چند دن قبل حج پر تشریف لے گئے تھے عید کے فوراً بعد بظاہر واپسی کا کوئی امکان نہیں، لیکن بندہ اپنے ادراک پر مصر تھا۔ چنانچہ ایک ساتھی معلومات کے لیے حضرت کے مخلص قاری نذیر صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت واقعی رات ساڑھے بارہ بجے کی فلائٹ پر تشریف لائے تھے اور ابھی ہی ناشتہ کر کے خانقاہ تشریف لے گئے ہیں۔

شہر تو شہر ہے؛ سچ پوچھو تو کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بندہ نے روحانی فضا کو مکدر اور سُونا سُونا پایا۔ خیال ہوا کہ شاید حضرت خواجہؒ ملک میں تشریف فرما نہیں ہیں۔ چنانچہ معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ واقعی حضرت خواجہؒ بیرون ملک کے دورے پر تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو یدِ بیضاء لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

قصہ عجیبہ: حضرت خواجہؒ اگرچہ آخری سالوں میں مندرجہ بالا سکوت پر بہت کاربند تھے، لیکن اٹھارہ بیس سال قبل کی مجالس میں سوالوں کا خاطر خواہ جواب ضرور مرحمت فرمائے تھے۔ بندہ جب بھی مجلس میں ہوتا تو تصوف کے کسی موضوع پر ضرور پوچھ گچھ کرتا رہتا اور حضرت بھی شفقت فرماتے ہوئے واجبی سا جواب ضرور مرحمت فرماتے۔ اتفاق سے بندہ نے تصوف کی کوئی بات پوچھی تو حضرت بات سنتے ہی فوراً خلافِ معمول اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ ساری مجلس میری طرف دیکھنے لگی۔ بندہ خود اپنی جگہ پریشان؛ کہ خدانخواستہ کوئی گستاخی مجھ سے ہوئی ہے کیا؟! لیکن مجلس کے ایک حاضر باش، مزاج

شناس نے میری طرف اشارہ کیا کہ آپ بھی حضرت کے پیچھے چلے جائیں۔ بندہ لرزتی ٹانگوں سے حضرت کے پیچھے چل پڑا۔ چنانچہ حضرت کشاں کشاں خانقاہ کی لائبریری میں تشریف لے گئے اور خانہ کتبِ تصوف کے سامنے قیام فرما ہوئے۔ بندہ پیچھے کھڑا رہا۔ حضرت نے کچھ دیر کی تلاش کے بعد تصوف کی مشہور کتاب ''لوائح جامی'' نکالی۔ فہرست دیکھی اور پھر کتاب بندہ کے ہاتھ میں تھمادی فرمایا کہ اس کا فلاں جگہ سے مطالعہ کرلو۔ چنانچہ واپس ہم دونوں حجرہ شریفہ پہنچے۔ دوپہر کی فرصت میں بندہ نے کتاب کا مطالعہ کیا اور ظہر کی مجلس میں عرض کی کہ میں نے کتاب کا مطالعہ کرلیا ہے، لیکن اس میں چند باتیں غلط ہیں!! حضرت نے فرمایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بندہ نے وہ مقام کھول کرآگے کردیا۔ حضرت دیکھ کر مسکرائے فرمایا کہ ہاں کتابت کی غلطی سے مضمون غلط ہوگیا ہے۔ پھر رات کی مجلس میں جس میں ساتھی نسبتاً کم ہوتے تھے، بندہ نے وحدۃ الوجود کی بحث شروع کی۔ حضرتؒ نے کافی معلومات افزا جوابات عنایت فرمائے جو آخر میں مکتوب کے بعد بندہ ذکر کرے گا۔ ایک جواب جس پر بندہ نے اشکال ظاہر کیا؛ اس کا جواب با حوالہ دکھانے کے لیے حضرتؒ نے فرمایا کہ اپنے پیچھے موجود الماری سے فلاں کتاب دے دو۔ حضرت نے وہ حوالہ تلاش کرنے کی کافی کوشش فرمائی، لیکن پندرہ منٹ کی جستجو کے باوجود حوالہ نہ مل سکا۔ آخر بندہ نے عرض کی کہ چلو پھر کسی موقع پر تلاش کرلیں گے، لیکن حضرت نے میری بات سنی اَن سنی کردی اور حوالہ کی تلاش جاری رکھی جبکہ بندہ کو پہلے سے علم تھا کہ حضرت خواجہؒ شیخ المشائخ شاہ غلام علی مجددیؒ کا قول مجھے دکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب تلاش کو پون گھنٹے کے قریب وقت ہوگیا اور تمام ساتھی میری طرف بار بار دیکھنے لگے کہ حضرت کو تم نے ویسے مشقت میں ڈال رکھا ہے تو بندہ نے دوبارہ عرض کی کہ حضور صبح تلاش کرلیں گے، لیکن حضرت بدستور ورق گردانی فرماتے رہے۔ بالآخر مجبوراً بندہ کو آخری پتہ پھینکنا پڑا کہ میرے خیال میں حضور مجھے شاہ غلام علیؒ کا ارشاد دکھانا چاہتے ہیں، وہ پہلے سے میرے علم میں ہے۔ حضرتؒ نے مسکرا کر کتاب بند فرمادی اور فرمایا کہ میں وہی دکھانا چاہتا تھا۔ حضرت نے مجھ نالائق کے وسعت مطالعہ کی تعریف بھی فرمائی، نیز شکریہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔

کمالِ عظیم

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کے جن چند جلیل القدر مشائخ کرامؒ کو آنحضرت جل سلطانہ نے شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت کی جامعیت کی بنا پر پیری کی پوری پوری حقیقت مع لوازمہا وآثارہا عنایت فرمائی تھی؛ حضرت خواجہؒ اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر ان مشائخ میں خاص مقام کے حامل تھے۔

مشائخ طریقت کی عام طور پر تین اقسام ہر دور میں رہی ہیں۔ بندہ نے بھی تینوں اقسام کو دیکھ رکھا ہے:

قسم اوّل: بعض مشائخ طریقت اگرچہ عملی، حالی اور باطنی طور پر کمالاتِ تصوف سے حسب استعداد خاطر خواہ حد تک متحقق ہوتے ہیں اور باریاضت ہونے کی بنا پر دوسرے کی تربیت اور اصلاح بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن علمی طور پر تصوف کی حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ چنانچہ صاحب استعداد لوگ اگر علمی طور پر کوئی اشکال یا سوال، تصوف کے بارے میں ان سے پوچھیں۔ تو وہ جواب دینے سے عاجز ہوتے ہیں۔ ایسے مشائخ کی کثیر تعداد ہر دور میں خصوصاً آخری دور میں رہی ہے۔

قسم دوم: ایسے مشائخ جو عملی، حالی، روحانی اور باطنی کمالات میں بھی بیچارے کمزور ہوتے ہیں اور علمی طور پر بھی تصوف کے فن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ایسے حضرات کو مشائخ کی بجائے پیران کرام کہنا چاہیے اور مجھ کم نصیب جیسے اکثر پیر

اس دور کے تقریباً ایسے ہی ہیں۔

قسم سوم: ایسے مشائخ کرام جو واقعی سجادہ نشین ہیں۔ شریعت، طریقت اور حقیقت کے تمام پہلوؤں پر علمی، عملی، روحانی غرضیکہ ہر لحاظ سے حاوی ہوتے ہیں۔ کمال و تکمیل میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں؛ فن کے بہترین شارح اور تسلی بخش جواب دہندہ ہوتے ہیں اور تصوف کے دقائق، معارف، رموز و اسرار کے پوری طرح آشنا ہوتے ہیں۔ پہلے ادوار میں ایسے مشائخ بکثرت ہوتے تھے۔ لیکن آخری ادوار میں کم، اور دورِ حاضر میں سوائے حضرت خواجہؒ کے کوئی شخصیت راقم الحروف کی نظر سے اِس پائے کی نہیں گذری۔ فنِ تصوف سے ناآشنا لوگ خواہ عوام ہوں یا خواص، عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ پیری ایک معمولی، عام اور آسان سا کام ہے۔ حتیٰ کہ عوام تو عوام ہیں؛ خواص بلکہ علماء میں سے بھی کئی حضرات یہ کہتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ پیری تو ہر بندہ کر سکتا ہے؛ صرف یہی تو بتانا ہوتا ہے کہ اتنی دفعہ فلاں ذکر کیا کرو اور بس۔ حاشا وکلاّ ثم حاشا وکلاّ !!

بلا مبالغہ حق بات یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے تمام کاموں میں سب سے مشکل ترین کام پیری ہے۔ بڑے بڑے لوگ اس فن میں ناقص پائے گئے۔ پیری کیا ہے؟ اس کی حقیقت پر قدرے روشنی ڈالتے چلوں؛ تاکہ مغالطہ دہندگان کی غلط فہمی یا خوش فہمی دور ہو سکے۔

پیری نام ہے: آنحضرت جل سلطانہ کے مراتب قرب میں اپنے کمال اور دوسروں کی تکمیل کا۔ کمال کیا ہے؟ کمال نام ہے تین چیزوں کا:

۱۔ ظاہراً و باطناً پورا پورا متبع شریعت و سنت متقی ہونا۔

۲۔ باطن کا انوارِ حقیقت میں مستغرق ہونے کی بنا پر لطائف عشرہ کا پورا پورا مصفّیٰ و مزکّیٰ مجلّیٰ و مجلّیٰ ہونا۔ قالب کا اعتدالِ حقیقی سے مشرف ہونا۔ مقام بی یسمع و بی یبصر کی بنا پر فنا فی اللہ و بقا باللہ سے مشرف ہونا۔ صاحبِ کشفِ عیانی یا کم از کم صاحبِ کشف وجدانی و ادراک باطنی ہونا۔ دنیا و ما فیہا کی محبت سے بالکلیہ خالی ہونا۔ دن رات کی کوئی گھڑی ریاضت، اعمال یا مشاہدہ و توجہ الی اللہ سے خالی نہ ہونا۔

۳۔ آنحضرت جل سلطانہ کے معاملات کو پوری طرح سمجھنا اور ان کے مقتضیٰ پر ہمہ وقت عمل پیرا رہنا۔

جبکہ مقامِ تکمیل نام ہے مندرجہ ذیل تمام صفات سے متصف ہونے کا: جب کوئی بیعت کے ارادے سے آئے؛ اس کی استعداد کو دیکھنا، کہ قربِ عام کی استعداد رکھتا ہے یا قربِ خاص کی۔ اگر استعدادِ قربِ خاص رکھتا ہے؛ تو راہِ ولایت کی استعداد رکھتا ہے یا راہِ نبوت کی؛ بصورت ولایت استعدادِ جذب رکھتا ہے یا سلوک کی۔ کیونکہ ان میں سے ہر استعداد کے مناسب علیحدہ اذکار و اوراد ہیں۔ اصحاب بصیرت نے دیکھا ہوگا کہ مشائخ سے بیعت کے بعد مختلف اسباق مختلف سالکین کو جو ملتے ہیں؛ اس میں اصل راز یہی استعداد کا فرق ہے۔ پھر سالک کس لطیفے یا مشرب سے خاص تعلق رکھتا ہے یا کس نبی کے زیرِ قدم ہے؛ تاکہ اس لطیفے پر خاص توجہات اور محنت کرائی جائے۔ عنایت شدہ ذکر اُس نے کیا ہے یا نہیں؟! اس کے لطائف اس سے متاثر ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگلا سبق دیے جانے کے قابل ہے یا نہیں؟! عالم امر سے مناسبت کم رکھنے کی صورت میں، خصوصی توجہات سے اُس کی مناسبت پیدا کرنا، تاکہ ناسوتی صفات چھوڑ کر ملکوتی صفات کی طرف ترقی کرے۔ پھر بحالت جذب، کیفیات و واردات کا تحمّل نہ کر سکنے کی صورت میں اس کو مصلحت کی خاطر واپس نیچے لانا یا بصورتِ تحمّل توجہ سے اُس کو اُس کیفیت سے بالا مقام پر لے جانا۔ سالک کی شرعی خامیوں سے پوری طرح باخبر رہنا اور اس مقام سے اس کو نکالنے کے

لیے نصیحت، توجہ و دعا سے اُس کی دستگیری کرنا۔ سالک کے کسی گناہ کی بنا پر نزولِ غضبی یا نزولِ عدلی کا شکار ہو کر عروج کھو دینے پر دوبارہ اُس کو اس مقام تک پہنچانا۔ بصورت استعداد عالی جونسی تجلیات اس سالک کے لیے نافع ہیں؛ اُن کو اس پر وارد کرنا اور مضر تجلیات سے بذریعہ بائی پاس کسی بالا تجلی تک پہنچانا۔ صاحبِ استعداد غیر ملکی مریدین یا دور دراز رہنے والے عشاق سالکین کو دور دراز کی توجہ سے مقاماتِ عالیہ تک پہنچانا اور سالکین کو پیش آنے والے علمی و حالی اشکالات سے تسلی بخش طریقے سے نجات دینا۔ فنافی الشیخ، فنافی الرسول اور فنافی اللہ جیسے مقامات سے گزار کر مقامِ احسان تک اس کو پہنچانا۔ عالم غیب کے رُموز و اسرار سے رفتہ رفتہ اُس کی مناسبت پیدا کر کے، ان کے حقائق کو سمجھنے کی استعداد اُجاگر کرنا۔ بے استعداد یا ضعیف الاستعداد سالکین پر انعکاس کی وجہ سے کھلنے والے کشوف کو بخاطرِ مصلحت بند کرنا۔ واقعات و منامات کی صحیح تعبیر کی عکاسی کرنا۔ سالکین کے علاوہ عام ملاقاتی حضرات کی حقیقت پر مطلع ہونا؛ تاکہ نزّلوا کل رجل منزلتہ پر عمل کیا جاسکے اور پھر سب کچھ کے باوجود اپنی حقیقت کو ان کی آلودگیوں سے بچائے رکھنا۔ اپنے اور سالکین کے اعمال و اشغال کے انوار و اثرات پر علمی و حالی پوری پوری گرفت رکھنا۔ مجلس پہ مختلف الجہات وارد شدہ کیفیات کے اسباب پر نظر رکھنا۔ غرضیکہ اس قسم کی بیسیوں وجوہ کے اسباب و علل، ثمرات و نتائج پر علماً و تصرفاً پوری طرح حاوی رہنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے اکثر صفات کا مدار کشف و ادراکِ باطنی پر ہے۔ جن کا مدار ریاضتِ دائمی اور لقمہ حلال پر ہے۔ آج کل دورِ حاضر میں نظام کے بأکثر الوجوہ سودی ہونے کی بنا پر رزق حلال تقریباً مفقود ہے ہر جگہ مکروہ یا مشتبہ طعام سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان حالات میں حتی الوسع احتیاط و تقویٰ کو ملحوظ رکھنا۔

سودی نظام ہے اور یہ تقویٰ کی آرزو　　کتنا حسین فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم

اور پھر ریاضتِ دائمی کے لیے حضرت حق جل مجدہ کے عشق و محبت سے سرشار ہونے کی بنا پر سالہا سال کی شبہائے تاریک کو روشن و زندہ رکھ کر اس شعر کا مصداق بننا:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں　　کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

غرضیکہ پیری کے یہ لوازم و آثار کم از کم دورِ حاضر کے لحاظ سے اتنے مشکل اور کٹھن ہیں کہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہیں۔ ان لوازم و آثار کے ہوتے ہوئے پیری کو ایک عام اور آسان سا کام سمجھنا؛ خالی از خرد ہونے کی علامت ہے۔ دورِ حاضر میں پیری کے ان لوازم و آثار کے ساتھ امام وقت حضرت خواجہؒ پوری طرح متحقق اور متصف تھے۔ اگرچہ پیری کے اس رُخ کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں رسمی پیری کا ایک دوسرا رخ بھی بہت وسیع حد تک موجود ہے جس کی عکاسی یہ شعر پوری طرح کر رہا ہے:

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن　　میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد

چنانچہ حضرت خواجہؒ جیسے مشائخ کو ہر وقت مریدوں کے جلو میں گھرے ہوئے دیکھ کر للچانے والے راہگیر اسی غلط فہمی کی بنا پر، پیر بننے کی سعی لا حاصل میں ہر ناجائز ہتھکنڈوں تک استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ لیکن خالی از روحانی کمالات آدمی کو یہ کون سمجھائے کہ پیری تو اوپر سے نازل ہوتی ہے ایڑی چوٹی کا زور لگانے سے اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے نہیں حاصل ہوتی:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علمی عبورِ کامل درفنِ تصوف

جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حضرت خواجہؒ جامع مشائخ میں سے تھے۔علمی طور پر بھی فن تصوف پر عموماً اور علوم مجددیہ پر خصوصاً عبورِ کامل رکھتے تھے۔فنی اصطلاحات وحقائق کے بہترین اور مستند شارح تھے۔استشہاد کے طور پر حضرت خواجہؒ کے دو تین مکتوبات کا ذکر کر رہا ہوں ؛ جو بندۂ ناچیز کے نام حضرت خواجہؒ نے سوالوں کے جواب میں ارسال فرمائے۔جس سے حضرت خواجہؒ کے علمی بلند مرتبہ کی کسی قدر عکاسی ہوتی ہے۔

عرصہ دراز قبل بندہ نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ایک عریضہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں ارسال کیا۔جس کا جواب حضرتؒ نے مندرجہ ذیل عنایت فرمایا جو کہ مِن وعَن نقل کیا جا رہا ہے:

''مکرم ومحترم جناب رشید الحق صاحب مطالعہ فرماویں ؛ کہ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔آپ نے جس مسئلہ کے متعلق اِس فقیر سے رجوع فرمایا ہے۔وہ مسئلہ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ذوقی اور وجدانی بھی ہے اور مــن لم یذُقْ لــم یـدْرِ کا مصداق ہے اور یہ فقیر دونوں سے عاری ہے۔وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود: یہ تصوف کے معرکتہ الآراء مسئلے ہیں۔حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ الأقدس سے پہلے صرف وحدۃ الوجود ہی کی بحث چلتی تھی۔ہمارے علماءِ اسلام دیو بند رحمہم اللہ تعالیٰ وحدۃ الوجود کے ہی قائل ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں اصطلاحوں میں تطبیق دینے کی سعی فرمائی جو اُس دور کے نقشبندی مجددی حضرات نے قبول نہیں فرمائی اور اب یہ مسئلہ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔اس کا ذوق اور وجدان رکھنے والے اگر موجود ہیں تو وہ ہمیں معلوم نہیں۔حضرت شیخ اکبرؒ سے بعض مسائل میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اختلاف کیا ہے،لیکن اختلاف کے باوجود اُن کے متعلق اپنے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی میں نظر آتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کی آسان سی تعبیر ہمہ اوست سے کی جاتی ہے اور وحدۃ الشہود کی ہمہ از اوست سے۔اِن تعبیرات سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن وسنت کے قریب کونسی اصطلاح پڑتی ہے۔بہت مدت ہوئی مولانا محمد عبداللہ دھرم کوٹی مرحوم ؛ جو کہ حضرت رائے پوری حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے خلفاء میں تھے،کے ساتھ ایک رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔وہ سحری کے وقت اُٹھے۔تہجد کے بعد انہوں نے اپنے طریقہ کے مطابق ذکرِ جہر شروع کیا۔وقفے وقفے کے بعد وہ یہ بھی ترنم کے ساتھ کہتے تھے:

جس طرف دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

اِسی طرح حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ہے:

مَن تُو شُدم تُو مَن شدی مَن تن شُدم تُو جان شُدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں مَن دیگرم تُو دیگری

یہ اِسی ہمہ اوست کی کیفیت کا پَرتو ہے اور اسی سے بے دین لوگوں نے اتحاد،حلول،تجسیم کے غلط مسائل پیدا کیے ہیں اور تصوف کے منکرین نے انہی غلط چیزوں کو دیکھ کر کہا ہے: کہ تصوف میں ہندوستان کے جوگیوں کے اثرات ہیں۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود تصوف کی اصطلاح ہیں۔ان کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔عقائد سے تعلق اس توحید کا ہے،جس کی تعبیر قرآن وسنت میں موجود ہے۔یہ اصطلاحیں اس کے اعتبارات ہیں۔حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

نے وحدۃ الوجود کا انکار نہیں فرمایا؛ وہ فرماتے ہیں: سالکین راہ کو وسط میں یہ کیفیت بعض پر وارد ہوتی ہے اور بعض پر وارد نہیں ہوتی اور انتہا میں اس کیفیت کی بجائے وحدۃ الشہود کی کیفیت وارد ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرات نے لکھا ہے کہ جس پر یہ کیفیات وارد نہ ہوں، اُس کو اس پر کلام نہیں کرنا چاہیئے!! احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے، فقیر اپنے اندر اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ افسوس ہے!! کہ فقیر اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ فقیر بفضلہٖ تعالیٰ بعافیت ہے۔ والحمد للّٰہ علیٰ ذلك ۔ فقیر آپ سب حضرات کی صحت وعافیت اور سلامتی کا طالب ہے۔ مولا پاک نصیب فرماوے۔ آمین۔ فقیر کی طرف سے سب حضرات کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسلام''

یہ مکتوب حضرت خواجہؒ نے وفات سے چوبیس سال قبل تحریر فرمایا ہے۔

حضرت خواجہؒ نے باوجود مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے اصل اختلاف سے احتیاطاً پہلوتہی فرماتے ہوئے معذرت فرمائی ہے۔ لیکن جیسے کہ قبل ازیں بندہ ذکر کر چکا ہے کہ اس مسئلہ کو بالمشافہہ حضرت سے مختلف مجالس ومواقع میں استفسارات کر کے بندہ نے سمجھا ہے اور امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ اور امام وقت حضرت خواجہؒ کے فرمودات کا حاصل جو کچھ ہے ؛ کافی ساتھیوں کے عرصہ دراز کی خواہش اور اصرار پر نقل کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ باذوق حضرات خصوصاً علومِ مجددیہ کے شائقین کے لیے فائدے کا باعث ہوگا۔

وحدۃ الوجود کا اطلاق دو مقامات پر ہوتا ہے:

۱۔ دورانِ سلوک عروج اور حال کی ایک منزل پر۔

۲۔ حقیقتِ کائنات کے ضمن میں۔

۱۔ ''توحیدِ وجودی'' یا ''ہمہ اوست'' درعروج وحال: طالبِ حق جب کسی کامل مکمل شیخ کی اجازت سے، نیز ذکر وفکر ومراقبات کی کثرت سے تصفیہ وتزکیہ سے اپنے لطائف کو منور اور مزین کر لیتا ہے۔ عالمِ امر اور ملکوت سے پوری پوری مناسبت حاصل کر کے دائرہ امکان سے گزر جاتا ہے۔ تو بعض سالکین کو (اغلب ہے کہ وہ مجذوب سالک ہوتے ہیں) سیرِ برزخی اور ظلی کی انتہاء میں اور سیرِ اصلی وصفتی کی ابتداء میں آنحضرت جل مجدہ کے غلبہ محبت کی بناء پر؛ اچھے اور برے آئینوں میں؛ یعنی مظاہر خیر وشر میں محبوب کی وحدت کا جمال مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہر اچھے بُرے فعل کو اسی کا فعل پاتا ہے۔ غلبہ حال کی وجہ سے تمیز رفع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آئینہ سے غافل ہو کر؛ مظہر کو ظاہر کا عین، مخلوق کو خالق کا عین جانتا ہے۔ ہر چہ خوباں کنند خوب آمد کے تحت ایمان کی طرح کفر کو بھی اُس کا فعل جان کر بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ غرض یہ کہ اسی مغلوبیت کی بنا پر امیر خسروؒ کی طرح

ہر چہ آید در نظر غیرِ تو نیست   یا توئی یا بوئے تو یا خوئے تو

کے راگ الاپتا ہے۔ حسن بن منصور حلاجؒ کا:

کفرت بدین اللّٰہ و الکفر واجب   لدیّ و عند المسلمین قبیح

کہتے رہنا۔ امام ربانی کا:

کفر وایماں زلف وروئے آں پری زیبائی است   کفر و ایماں ہر دو اندر راہِ ما یکتائی است

اپنے مرشد محترم کو تحریر فرمانا۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا:

غافل از خود ماند از صورت چوں پر شد آئینہ تا ترا شناختم جاناں ز خود بیگانہ ام

گنگناتے رہنا۔ بایزید بسطامیؒ کا: لیس فی جبتی سوی اللہ کا اظہار کرنا۔ شیخ جامیؒ کا:

در ہر چہ نظر کردم غیر از تو نمی بینم غیر از تو کسے باشد حقا چہ مجال است ایں

کے زمزمے گانا۔ یہ سب اسی مقام کے پرتَو، کیفیات اور پھول ہیں۔

مجنون کا لیلیٰ کے عشق مجازی میں:

اَمرّ علیٰ الدیار دیارِ لیلی اقبّل ذا الجدار وذا الجدارا

کے ترنم سے انہی کیفیات کا اظہار ہے۔

چونکہ توحیدِ وجودی کا یہ حال آنحضرت جل سلطانہ کے غلبہ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور مقدمہ فنا ہے۔ گذشتہ مقامات کی بہ نسبت محمود ہے۔ لیکن چونکہ دوئی اور کثرت؛ نظر سے ساقط نہیں ہوتی علم الیقین کی قسم سے ہے اور سالک کے وجود کو فنا نہیں بخشتا؛ اس لیے ناقص مقام ہے۔ سالک کو اس مقام سے جلد گزر جانا چاہئے۔ کیونکہ یہ دید اور مشاہدہ، غلبہ حال کی وجہ سے ہیں۔ نفس الامر کے مطابق نہیں یعنی مظہر، عینِ ظاہر نہیں۔

یہ مندرجہ بالا تمام مشائخ اس مقام میں رہے ہیں لیکن بالآخر اس سے گزر کر بلند مقامات پر پہنچے ہیں۔ اس مقام والوں کو ''وجودیہ عینیہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ مقام سلوک میں ہر ایک کو پیش نہیں آتا بلکہ حسب استعداد بعض کا عبور اس مقام میں ہوتا ہے۔ اس کی مثال مشائخ نے یوں دی ہے کہ رات کے وقت ستاروں کی روشنی کو اصحابِ بصیرت سورج کی روشنی کا پرَتو کہتے ہیں۔ لیکن سورج کے غلبہ محبت اور کمال روشن ہونے کی وجہ سے ستاروں میں اس کے نور کے عکس کو دیکھ کر ستاروں کو بھی سورج کہتے پھرنا!؛ ظاہر ہے کہ یہ دید اور شہود خلافِ واقعہ ہے۔

لیکن یہ توحیدِ وجودی کا مقام باوجود ناقص ہونے کے اسی وقت محمود ہوگا جب غلبہ محبت کے حال کی وجہ سے ہوگا۔ جیسے کہ مشائخ کو عنایت ہوا ہے لیکن اگر محض قال اور تکرار کی حد تک ہے؛ مشائخ کی پیروی میں ان کے حال کی علمی عکاسی کی حد تک ہے تو انتہائی مذموم ہے۔ کیونکہ مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ اس مقام میں بھی شرع شریف پر پوری طرح کاربند رہے ہیں۔ باوجود غلبہ حال کے سرِ موشریعت سے تجاوز نہیں کیا۔ لیکن محض قال رکھنے والے چونکہ تمام کونی تعینات کو حضرتِ حق ہی کہتے پھرتے ہیں؛ شرع شریف سے مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔

پرانے وقتوں میں ایسے ملحد لوگ ہر دور میں بے شمار ہوئے ہیں۔ دینِ اکبری کی بنیاد اور داراشکوہ کے نظریات کی اساس یہی لوگ ہوئے ہیں۔ امام ربانیؒ نے مکتوبات میں جا بجا اور حضرت خواجہؒ نے گزشتہ مکتوب میں ملحد اور بے دین کہہ کر انہی لوگوں کا رد کیا ہے۔ بندہ نے اس دور میں اپنی زندگی میں صرف ایک آدمی اس طرز کا دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اور بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہوں۔ عرصہ ہوا کہ اسلام آباد سے پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پرانے صوفی بزرگ کے مزار پر جانا ہوا۔ جب ہم واپس نکلنے لگے تو سجادہ نشین صاحب کا خادم ہمارے استقبال میں کھڑا تھا۔ علیک سلیک کے فوراً بعد سجادہ نشین صاحب بھی آن وارد ہوئے۔ بڑے اصرار سے اپنے ساتھ لے گئے۔ مزار کے احاطے میں چمن کے لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، ان پر بیٹھنا ہوا۔ انہوں نے خادم کو چائے لانے کا آرڈر دیا اور خود باتوں باتوں میں اپنا حدودِ اربعہ بیان کرنا شروع کیا۔ ظاہری جسم پر شرع شریف کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ ڈاڑھی شریف بالکل غائب تھی۔ ٹوپی رومال کا بھی کوئی ذکر نہ تھا۔ رفتہ رفتہ

اسی وحدت الوجود کی رسمی قالی تکرار شروع کی اور چائے کے وقفے کے علاوہ گھنٹہ ڈیڑھ اسی میں صَرف کر دیا۔ جانوروں حتیٰ کہ سانپ، بچھو تک کو نعوذ باللہ حضرتِ حق بتایا۔ میری متجسس نظروں سے بھانپ گئے اور کہا کہ میں نے بھی بہت ریاضت کی ہے۔ پورے نو سال رات دن ایک کر دیا تھا۔ بڑی بڑی متشرع ڈاڑھی تھی، لیکن اتنی کڑی ریاضت سے جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو مایوسی کا شکار ہو کر پوری ڈاڑھی منڈوا کر، ننکانہ صاحب میں گورونانک صاحب کے نام ہدیہ کر آیا ہوں۔ نعوذ باللہ!!

بندہ نے بار بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُن کی پھرتی نے ایک نہ چلنے دی اور کہا کہ آپ جیسے لوگ ایسی جگہوں پر ضرور آتے رہنے چاہئیں۔ بمشکل جان چھڑائی تو رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آئے۔ سلام لیتے وقت ہاتھ تھامے تھامے مزید آدھ پون گھنٹہ اسی بحث میں صرف کر گئے۔ پندرہ سال گزر گئے ہیں باوجود اس صوفی بزرگ کے مزار پر فاتحہ خوانی کا شوق رکھنے کے، صرف انہی سجادہ نشین صاحب کی وجہ سے دوبارہ نہیں جا سکا۔ سنا ہے کہ اب تو وہ اس بحث میں بالکل فنا ہو چکے ہیں اور علماءِ کرام اُن کے کفر کا فتویٰ تک دے چکے ہیں۔

الغرض توحیدِ وجودی کا مقام بصورتِ حال محمود لیکن ناقص ہے۔ جبکہ بصورتِ قال سراسر خلاف شرع ہے اور کفر کی دہلیز تک پہنچانے والا ہے۔ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ سے اس توحید وجودی کا جو انکار معروف و مشہور ہے۔ وہ نفسِ مقام کا انکار نہیں بلکہ اس مقام کے مقامِ کمال ہونے کا انکار ہے۔ ورنہ امام ربانیؒ خود بھی سالہا سال دوسرے مشائخ کی طرح اس مقام میں رہ چکے ہیں اور مکتوبات شریفہ میں ابتدائی تمام مکتوبات کے معارف و علوم اسی مقام سے ناشی ہیں۔

۲۔ ''توحیدِ شہودی'' در حالِ عروج: گزشتہ سالک کو آنحضرت جل سلطانہ توحیدِ وجودی سے ترقی بخشتے ہیں یا تمام سالکین بذریعہ بائی پاس اس مقام سے پار ہو جاتے ہیں۔ تو تمام مظاہرِ خیر و شر، نظر سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ دیدہ بصیرت میں صرف اور صرف حضرتِ حق جل مجدہ کا شہود باقی رہ جاتا ہے۔ جیسے دن کے وقت سورج کے نکلنے سے تمام ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام فنا ہے اور اس راہ کی ضروریات میں سے ہے۔ کوئی سالک اس مقام سے گزرے بغیر ولی نہیں بن سکتا اور اسی کو عین الیقین کہتے ہیں۔

یہ مقام چونکہ سالک کے وجود کو فنا بخشتا ہے؛ اس لیے توحید وجودی کی بہ نسبت مقامِ کمال ہے۔ اس مقام کو ''توحیدِ شہود حقیقی'' یا صرف ''اوست'' کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ سالک جب تک زندہ ہے بلحاظ شرع مخلوقات کے حقوق کا مکلّف ہے۔ اس لیے یہ مقام باوجود پہلے مقام سے کمال ہونے کے آئندہ مقامات کی بہ نسبت مقامِ نقصان ہے۔ فنا کی وجہ سے بہت سارے حقوق سے عہدہ برآں نہیں ہو سکتا اور ویسے بھی ولایت، فنا اور بقاء دونوں چیزوں کے بغیر متحقق نہیں ہوتی۔ اس لیے اس مقام سے بھی توحید وجودی کی طرح گزرنا چاہیئے ورنہ ولایت ثابت نہیں ہو سکے گی۔ امام ربانیؒ نے جس معنی میں توحیدِ وجودی کا انکار فرمایا ہے؛ اسی معنی میں اِس توحیدِ شہودی کا بھی انکار فرمایا ہے۔ صرف اوّل کی بہ نسبت اِس کو کسی قدر اعلیٰ بتایا ہے۔

۳۔ ''توحیدِ شہودی ظلّی'' یا ''ہمہ از اوست'': جب سالک کو توحیدِ شہودی اور مقامِ فنا سے مقامِ بقاء میں پہنچاتے ہیں۔ تو قبل از فناء، وجودِ حقیقی کے ساتھ مشہود ہونے والی تمام کائنات، مخلوقات اور کثرت؛ جو مقامِ فنا میں نظر سے غائب ہو گئی تھی، دوبارہ وجودِ ظلّی کے ساتھ نظر میں واپس آ جاتی ہے۔ یہ مقام بقاء ہے؛ جس میں حضرتِ حق جل مجدہ کا شہود اپنے وجودِ حقیقی کے ساتھ اور مخلوقات کا شہود، وجودِ ظلّی کے ساتھ نظر میں رہتا ہے اور دونوں کے حقوق علیٰ حسب المراتب پورے پورے ادا ہو سکتے ہیں۔ اسی کو حق الیقین کہتے ہیں۔

اور مجددی حضرات کو جو ''شہودیہ ظلّیہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ وہ اسی مقام کی مناسبت سے ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تمام کامل اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اس مقام کے حامل ہوئے ہیں۔ خواہ وہ ''وجودیہ'' کہلاتے ہوں یا ''شہودیہ''۔

''شہودیہ'' کو اس مقام میں ''شہودیہ ظلیہ'' اور ''وجودیہ'' کو اس مقام میں ''وجودیہ ورائیہ'' سے موسوم کرتے ہیں اور نام میں فرق اس فکر و اعتقاد کی وجہ سے ہے جس کو عنقریب بندہ وحدۃ الوجود کے دوسرے اطلاق: ''حقیقتِ کائنات'' میں اختلاف کے ضمن میں بیان کرے گا اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جس طرح امام ربانیؒ نے وحدۃ الوجود کا انکار فرمایا ہے اسی طرح ''وحدۃ الشہود''، یا ''شہود ظلی''، یا ''ہمہ از اوست'' کا بھی انکار فرمایا ہے اور اس کو باوجود مقامِ کمال بتانے کے راستے کا ایک مقام بتایا ہے اور مقصد کو اس سے بہت اوپر بتایا ہے!!

فائدہ عظیمہ: عام مشہور اصطلاح کے مطابق علم الیقین کا معنی ہے: دھواں دیکھ کر آگ کا یقین ہو جانا اور عین الیقین کا معنی ہے: براہ راست آگ کو دیکھ کر آگ کا یقین ہو جانا اور حق الیقین کا معنی ہے: آگ میں ہاتھ ڈال کر یا سینک کر آگ کا اعلیٰ یقین حاصل کرنا۔

گذشتہ تینوں اَقسامِ توحید میں ان تینوں اَقسام کا اطلاق اسی اصطلاح کے مطابق کیا گیا ہے جو عام صوفیاء کی اصطلاح ہے، لیکن امام ربانیؒ کے نزدیک راہِ سلوک میں یہ تینوں اقسام اَثر کی طرف راجع ہیں۔ کیونکہ حضرت حق جل مجدہ کی رؤیت، باوجود ممکن ہونے کے اس دنیا میں غیر واقع ہے۔ لہٰذا علم الیقین کا معنی ہوگا: دھویں کے علم سے آگ کا یقین ہونا۔ عین الیقین کا معنی: دھواں دیکھ کر آگ کا یقین ہونا اور حق الیقین کا معنی ہوگا: دھویں سے متحقق ہو کر آگ کا یقین ہونا۔ آگ تینوں صورتوں میں نظر نہیں آئیگی۔ جیسے کہ حضرتِ حق یقین کی تینوں صورتوں میں مرئی نہیں ہونگے۔ ہاں! بصارت اور رؤیت کی بجائے دیدہ بصیرت کے اطلاق میں ممکن ہوگا۔

مذکورہ بالا فنا و بقا، نیز ظاہر اور مظہر میں اتحاد یا ظلیت کی نسبت چونکہ تجلی فعلی یا صفتی کی فنا و بقا سے وابستہ ہے اور امت مرحومہ کے اکثر مشائخ اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اسی مقام میں ہوئے ہیں، اس سے اعلیٰ مقامات یا تجلی ذاتی دائمی کا مورد ومہبط بننا چونکہ کروڑوں اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے خال خال کسی محمدی المشرب کا حصہ ہے اور اس آخری دور میں مجددی نسبت کے خواص میں سے ہے اور یہ وہ کمالات ہیں جو الف ثانی میں امام ربانیؒ کی براہ راست حضرتِ حق جل مجدہ کے تربیت فرمانے سے منصۂ ظہور میں آئے ہیں۔ جن کو ''کمالاتِ ثلثہ''، ''حقائق انبیاء'' و ''حقائق الٰہیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور امت میں انتہائی اعلیٰ استعداد رکھنے والے چیدہ چیدہ حضرات کو حاصل ہوئے ہیں اور سورۃ واقعہ کے قلیل من الآخرین سے یہی لوگ مراد ہیں۔

۴۔ **نسبتِ خالقیت ومخلوقیت:** جب کسی انتہائی اعلیٰ استعداد کے حامل سالک پر آنحضرت جل مجدہ نظرِ کرم فرما کر کمالاتِ نبوت کا انعکاس فرماتے ہوئے تجلّی ذاتی سے بہرہ ور فرماتے ہیں۔ تو کمالاتِ ولایت کی تمام نسبتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ کمالاتِ نبوت کے سامنے کمالاتِ ولایت کی اتنی حیثیت بھی نہیں جتنی سمندر کے سامنے ایک قطرہ حقیرہ کی!! چنانچہ اس نسبت کے وارد ہونے پر سابقہ اتحاد و ظلّیت کے دعوے بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ حضرت حق جل مجدہ خالقِ مطلق اور تمام کائنات مخلوقِ محض، حضرتِ حق قادرِ مطلق ربّ اور تمام ممکنات عاجزِ محض نظر آتی ہیں؛ جیسا کہ شرع شریف میں قرار پایا ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی تعلیمات اور آسمانی کتب کا خلاصہ یہی نسبت اور عقیدہ ہے اور تمام

مکلفین اسی عقیدہ کے مکلّف ہیں۔ امام ربانیؒ پر جب یہ نسبت وارد ہوئی تو فرمایا:

''اس فقیر پر بہت گراں گزرتا ہے کہ مخلوقات اور ممکنات کو عین ظاہر یا ظل ظاہر کہہ سکے۔ مخلوقات کی اتنی حیثیت کہاں سے آ گئی کہ اتحاد و ظلیت اس کے نصیب ہو سکے!!''

اس کو نسبتِ غیب الغیب اور مقامِ عبدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ نسبت عام اولیاء کرامؒ کی دسترس سے بالاتر ہے تو اس کے علوم و معارف بھی یقیناً ان کی سمجھ سے بالاتر ہوں گے۔ امام ربانیؒ نے اس نسبت کو سلوک تصوف کا مقصد بتایا ہے اور گزشتہ تمام مقامات کو راستے کی منازل اور مقصد کے سامنے ناقص مقامات بتایا ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک ''ذاتِ بحت'' تک عروج اور ''عدمِ صِرف'' تک نزول واقع نہ ہو سالک؛ خالق و مخلوق میں پورا پورا امتیاز نہیں کر سکتا اور شرک خفی اور اخفی کی تاریکیوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ اسی لیے امام ربانیؒ کا اپنے دور کے بارے میں فرمان ہے:

''کہ میں جب نظر کشفی سے دیکھتا ہوں تو پورے جہان میں صرف ایک آدمی کے کلمہ کو آنحضرت جل سلطانہ تک پہنچا ہوا پاتا ہوں۔ باقی سب کے کلمے علیٰ حسب المراتب راستے میں ہی رہ جاتے ہیں۔''

فللّٰہ در الشیخ المجدّدؒ ظاہر ہے کہ اس سے امام ربانیؒ کا اپنے انتہائی کمال قرب و معرفت کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ ''توحیدِ وجودی'' یا ''وحدۃ الوجود'' کا دوسرا اطلاق:

''توحیدِ وجودی'' یا ''وحدۃ الوجود'' کا دوسرا اطلاق ''حقیقت کائنات'' کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ اس پر تمام مشائخ صوفیاؒ کا اتفاق ہے کہ وجودِ حقیقی صرف ایک ہے اور وہ وجود آنحضرت جل سلطانہ کا ہے۔ وحدۃ الوجود پر اتفاق کا یہی معنی ہے لیکن اس اتفاق کے باوجود اس میں اختلاف ہے کہ یہ اتنی طویل و عریض کائنات اور ممکنات کی کثرت جو سب کو نظر آ رہی ہے یہ وجود نہیں رکھتی ہے کیا؟!! پھر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس اختلاف کو سمجھنے کے لیے چند مقدّمات کا سمجھنا ازبس ضروری ہے:

مقدمہ اولیٰ: شیخ اکبر شیخ ابن عربیؒ اور ان کے متبعین کے ہاں خارج میں صرف حضرت حق جل مجدہ کی ذات پاک موجود ہے اور کوئی چیز موجود نہیں حتیٰ کہ حضرت حق تعالیٰ شانہ کی صفات بھی خارج میں علیحدہ موجود نہیں بلکہ اس کے اسماء و صفات، حق تعالیٰ کی عینِ ذات ہیں اور نیز ایک دوسرے کے بھی عین ہیں: مثلاً علم و قدرت؛ جس طرح عین ذاتِ باری تعالیٰ ہیں اسی طرح علم، عینِ قدرت ہے اور اس کا عکس اور یہ بھی فرماتے ہیں: کہ اس مقام میں تعدد و تکثّر کا کوئی نام و نشان نہیں۔ صرف اتنا ہے کہ اسماء و صفات، شیون و اعتبارات نے حضرت حق کے علم میں اجمالی اور تفصیلی طور پر تمایز پیدا کیا ہے۔ خارج میں یہ تمایز و تباین مفقود ہے۔ چنانچہ اس کی تعبیر انہوں نے بدیں الفاظ کی ہے:

از روئے تعقل ہمہ غیر اند صفات   با ذات تو از روئے تحقق ہمہ عین

جبکہ امام ربانی کے ہاں حضرت حق جل مجدہ کی ''صفاتِ ثمانیہ''، ذات پاک کی طرح خارج میں موجود اور متمیز ہیں۔ جیسا کہ اہل حق علماء ماتریدیہؒ کے ہاں مقرر اور ثابت ہے۔ اگرچہ اشاعرہؒ تکوین کے سوا ''صفاتِ سبعہ'' کے قائل ہیں۔ پھر جس طرح صفاتِ ثمانیہ خارج میں حضرت حق سے متمیز ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے سے بھی متمیز ہیں۔ اگرچہ تمیز بھی بے کیف و بے چون ہے۔ یعنی قدرت، علم کا عین نہیں اور نہ ہی اس کا عکس ہے۔ اس خارجی تمایز کے ساتھ ساتھ حضرت حق جل مجدہ کے علم میں بھی یہ صفات متمایز و متباین ہیں۔ جیسے کہ پہلا گروہ بھی اس کا قائل ہے۔ امام ربانیؒ کے ہاں حضرت حق کے علم میں ان صفات و اسماء کے تمایز کے ساتھ ساتھ ان کے نقائض بھی متمیز ہیں اور انہوں نے بھی مرتبہ علم میں تفصیل پیدا کی ہے: مثلاً

مرتبہ علم میں صفتِ علم کا مقابل عدمِ علم ہے؛ جس کو جہل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح صفتِ قدرت کے مقابل عدمِ قدرت ہے؛ جس کو عجز کہا جاتا ہے۔ گویا کہ مرتبہ علم میں صفات کی طرح عدماتِ متقابلہ نے بھی تمایز حاصل کیا ہے۔

مقدمہ ثانیہ: شیخ اکبرؒ اور عام صوفیاءؒ کے ہاں حضرت حق تعالیٰ کی حقیقت ''واجبُ الوجود'' ہے اور ''وجود'' ذاتِ باری تعالیٰ کا عین ہے۔ جبکہ امام ربانیؒ کے نزدیک حضرت حق جل مجدہ کی ماہیت اور حقیقت ''ذاتِ محض'' ہے اور ''وجود'' اس سے زائد ہے مثل الصفات۔ رہا یہ کہنا: کہ ماہیت کا تحقق اور تقرر ''وجود'' کے بغیر کیسے ممکن ہے؟! تو یہ بات ممکنات کی حد تک تو درست ہے کہ ممکنات کی ماہیات اپنے تحقق اور تقرر میں وجود کی محتاج ہیں لیکن یہ فلسفیانہ اصول حضرت حق پر جاری نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ذات پاک وجود کی محتاج ہے:

فلسفی را چشمِ حق بین سخت نابینا بود   گرچہ بیکن باشد ویا بوعلی سینا بود

یعنی جس طرح ذات پاک باوجود جامع الکمالات ہونے کے مرتبہ ذات میں صفات سے پوری طرح مستغنی ہے اسی طرح باجود واجب الوجود ہونے کے مرتبہ ذات میں وجود سے بھی پوری طرح مستغنی ہے لہٰذا ''وجود''، عینِ ذات نہیں بلکہ اخصِ صفات میں سے ہے۔ یہ معرفت طورِ عقل سے بالاتر ہے اور صفات کے خارجی ہونے کی طرح مشکوۃ نبوت سے مقتبس ہے۔ چنانچہ امام ربانیؒ کا فرمان ہے:

''جب اس درویش کا ''وجود'' کے مرتبہ سے اوپر گزرا ہوا تو جب تک وہ حال مجھ پر غالب رہا، اپنے آپ کو ذوق ووجدان سے اربابِ تعطیل میں پاتا تھا۔ مرتبہ ذات میں ''وجود'' کی گنجائش نہ پاتا تھا۔ کیونکہ ''وجود'' کو راستہ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔''

صوفیاءؒ میں سے اس معرفت میں امام ربانیؒ کے ساتھ ''شہودیہ غیریہ'' کے شیخ علاء الدولۃ سمنانیؒ بھی شریک ہیں۔ ان کا قول ہے کہ: فوق عالَمِ الوجود عالَمُ المَلِكِ الودُود ۔ اسی طرح علماء اہل حق بھی اس معرفت میں شریک ہیں۔ ان کا فرمان ہے: ''وجود واجب تعالیٰ زائد است برذاتِ او سبحانہ''۔

مقدمہ ثالثہ: عام صوفیاء کرام کے نزدیک ''تعینِ اول'' یا ''وحدت''، تعینِ علمی ہے۔ جس کو ''حقیقتِ محمدیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن امام ربانیؒ نے تعینِ علمی سے اوپر ''تعینِ وجودی''، اس سے اوپر ''تعینِ حیاۃ''، اور ''تعینِ اول''، ''تعینِ حبی'' کو بتایا ہے۔ شیخ سمنانیؒ کے مندرجہ بالا قول سے بھی ''وجود'' کے اوپر ''ودود'' کے لفظ میں اسی ''تعینِ حبی'' کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ امام ربانیؒ کے ہاں تمام وہ صوفیائے کرامؒ جن کا عروج، اجمالِ علم تک ہوا ہے اور انہوں نے ''تعینِ اول''، ''تعینِ علمی'' بتایا ہے؛ علم سے اوپر کے مراتب تک رسائی حاصل نہیں کر سکے اور ان مراتب کو مبدأ سے جدا نہیں کر سکے۔

ظاہر ہے کہ عام صوفیائے کرامؒ اپنے مشائخ سے تربیت یافتہ ہیں اور زیادہ سے زیادہ صدی کے مجدد ہیں۔ جبکہ امام ربانیؒ براہ راست حضرت حق کے تربیت یافتہ اور الف ثانی کے مجدد ہیں۔ مشائخ کی تربیت اور حضرت حق کی تربیت میں زمین وآسمان کا فرق ہے!!

مقدمہ رابعہ: عام صوفیائے کرامؒ کے ہاں ''صورتِ شیٔ'' عینِ شیٔ ہے۔ جبکہ امام ربانیؒ کے نزدیک صورتِ شیٔ، شیٔ کا شبح ومثال ہے؛ عین نہیں ہے۔ آئینے میں نظر آنے والی آگ کی صورت، اگر خارجی آگ کا عین ہوتی تو صورت بھی جلاتی جبکہ صورت جلانے کا کام نہیں کرتی۔

مقدمہ خامسہ : کہ ''وجود'' ہر خیر وکمال کا مبدأ ہے اور تمام کمالات ''وجود'' کی طرف راجع ہیں۔ جبکہ ''عدم'' ہر نقص وشرارت کا منشأ بلکہ سراسر شرارت ہے اور تمام نقائص اور عیوب اسی کی طرف راجع ہیں۔

ان مقدماتِ خمسہ کے بعد کائنات کی حقیقت سمجھئے:

یہ مشاہد ومحسوس عرصۂ کائنات وممکنات شیخ ابن عربیؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک ''حضرتِ وجود'' ہے۔ جس کے سوا خارج میں کچھ موجود نہیں اور یہ حق تعالیٰ کی ذات کا وجود ہے۔ جس کو ''ظاہر وجود'' بھی کہتے ہیں۔ آنحضرت جل سلطانہ نے اپنی حکمت بالغہ سے اپنے علم ازلی میں تمام ممکنات وکائنات کی جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں۔ یہ صور علمیہ متکثرہ جن کو ''باطنِ وجود'' اور ''اعیانِ ثابتہ'' بھی کہتے ہیں۔ جب ''ظاہر وجود'' کے آئینے میں منعکس ہوتی ہیں، تو کثرت نظر آتی ہے۔ جس طرح کہ آئینے میں کسی شخص کی صورت منعکس ہو کر وجودِ تخیلی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ان صور علمیہ متکثرہ نے وجودِ تخیلی پیدا کیا ہے۔ خارج میں ''احدیتِ مجردہ'' کے سوا کچھ موجود نہیں۔ لیکن چونکہ اس متخیل اور متوھم عکس کو ابدی عذاب وثواب کی خاطر حضرت حق نے ثبات واستحکام بخشا ہے۔ اس لیے وہم وتخیل کے اٹھنے سے اٹھ نہیں سکتا اور مندرجہ بالا مقدمات میں گزر چکا کہ ان کے نزدیک صورتِ علمیہ، علم کا عین ہے اور علم عینِ ذات ہے۔ اسی طرح وجود بھی عین ذات ہے۔ اس لیے تمام متوھم اور متخیل کائنات پر ''اتحاد'' کا حکم کیا ہے اور ''ہمہ اوست'' کہا ہے۔ چنانچہ ان ابیات میں اسی نظریہ کی عکاسی ہے:

ہمسایہ و ہم نشین و ہمراہ ہمہ اوست — در دلق گدا وَ اطلس شہ ہمہ اوست

در انجمن فرق و نہانخانہ جمع — باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

اسی طرح مولوی جامی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے:

مجموعہ کون راہ بقانون سبق — کردیم تصفح ورقا بعد ورق

حقا کہ ندیدیم ونخواندیم درو — جز ذات حق وشیون ذاتیۂ حق

لیکن ان کے اس نظریے پر ممکنات اور کائنات کی شیطانیوں، شرارتوں، عیوب ونقائص کی زد جب پڑتی ہے تو کہتے ہیں: کہ ذاتی نقص وشرارت کسی چیز میں نہیں صرف نسبی اور اضافی ہے۔ لیکن امام ربانیؒ کے نزدیک کائنات کی حقیقت، مقدمہ اولیٰ میں ذکر شدہ ''اعدام متقابلہ'' ہیں۔ جن میں صور علمیہ کے عکوس جلوہ گر ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ''اعدام متقابلہ'' اسماء وصفات کے عکوس سمیت حقائق ممکنات ہیں۔ ''اعدام'' بمنزلۂ ھیولیٰ ہیں اور ''عکوس'' بمنزلۂ صور ہیں۔ قادرِ مختار جل شانہ جب چاہتے ہیں کہ ان ماہیات ممتزجہ میں سے کسی ماہیت کو موجود فرمائیں؛ تو حضرتِ وجود کا پَرتو، وجودِ ظلی اس ماہیت پر منعکس فرما کر آثار خارجیہ کا مبدأ بنا دیتے ہیں۔ گویا کہ ممکنات کے وجود اور صفات سب کے سب وجود حقیقی اور صفات باری کے ظلال اور عکوس ہیں۔ جو ''اعدام متقابلہ'' میں منعکس ہوئے ہیں۔ ''اعدام'' میں چونکہ خباثت، ذاتی اور شرارت، اصلی وجبلّی ہے؛ اس لیے تمام عیوب ونقائص کا منبع ہیں۔ آیۃ کریمہ ما أصابك من حسنة فمن الله و ما أصابك من سيئة فمن نفسك سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

غرض یہ کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے؛ سب کچھ ممکنات کی قسم سے ہے۔ اگرچہ بعض سالکوں کو وہ مشہود ''واجب'' کے ساتھ متوہم ہوتا ہے اور مقدمات میں گزر چکا ہے کہ امام ربانیؒ کے نزدیک صورتِ شئ، عینِ شئ نہیں۔ صفات عینِ ذات نہیں۔ ''وجود'' زائد از ذات ہے۔ اس لیے ممکن عین واجب نہیں ہو سکے گا اور ''ہمہ اوست'' کہنا درست نہیں ہوگا بلکہ

''ہمہ از وست'' کہنا ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ حق تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ جو کچھ دیکھا گیا، سنا گیا، جانا گیا، سب غیر ہے۔ کلمہ ''لا'' سے اس کی نفی کرنی چاہیئے۔

خلق را وجہ کے نماید او   در کدام آئینہ در آید او

حاصل یہ ہے کہ توحیدِ وجودی کے قائلین یا شیخ اکبرؒ کے ہاں کائنات کی حقیقت، حضرت حق کے ''ظاہر وجود'' کے آئینہ میں صور علمیہ متکثرہ کے انعکاس و تلبس سے محسوس و مشاہد، موجود نما کثرتِ موھومہ ہے۔ جو نقطہ جوّالہ کے دائرہ موہومہ کی مانند ہے اور توحید شہودی کے قائلین یا امام ربانیؒ کے نزدیک کائنات کی حقیقت، ''اعدام متقابلہ'' کے آئینوں میں اسماء وصفات کے عکوس کے انعکاس سے ظل، خارج میں موجود ظلال خارجیہ ہیں۔ چونکہ دونوں نظریات کے آئینے ''وجود'' و ''عدم'' سراسر ایک دوسرے کی ضد اور متقابلین ہیں۔ اس لیے دونوں نظریات میں تطبیق یا اختلاف ونزاع لفظی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ دونوں نظریات میں سے کونسا نظریہ حضرت حق جل مجدہ کی تقدیس وتنزیہہ کے قریب ہے؟!!

فائدہ عظیمہ خاصہ

جیسا کہ قبل ازیں گزر چکا کہ دوران سلوک امام ربانیؒ ان تمام منازل ومقامات سے گزرے ہیں۔ ہمہ اوست، صرف اوست، ہمہ از اوست، اور بالآخر کمالاتِ نبوت تک رسائی سے حضرت حق اور کائنات کے درمیان صرف نسبت خالقیت ومخلوقیت کے نظریہ شرعیہ تک انتہا ہوئی۔ چونکہ انما الاعمال بالخواتیم کے تحت اعتبار قولِ آخر کا ہوتا ہے؛ حال چونکہ قال میں دخیل اور اثر انداز ہوتا ہے؛ امام ربانیؒ کے مکتوبات شریفہ کے اول سے آخر تک تمام مکاتیب بالترتیب انہی چاروں کیفیات اور احوال کی عکاسی کرتے ہیں۔ اب امام ربانیؒ کو توحیدِ وجودی یا شہودی کی بجائے قولِ آخر نسبتِ خالقیت ومخلوقیت کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی تعلیمات اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ اب اس بحث میں الجھنا کہ امام ربانیؒ توحیدِ شہودی کے قائل تھے، توحیدِ وجودی کے منکر تھے؛ سراسر فضولیات میں داخل ہے!! قبل ازیں گزر چکا کہ امام ربانیؒ جس معنی میں توحیدِ وجودی کے منکر تھے؛ اس کو مقام ناقص، راستے کی منزل اور مقصد سے کوسوں دور بتاتے تھے۔ اسی معنی میں توحیدِ شہودی کے بھی منکر ہیں، اس کو بھی راستے کی منزل اور مقصد سے نیچے فرمایا ہے اور بنا برحال کے جس معنی میں توحیدِ شہودی کے قائل تھے اسی معنی میں توحیدِ وجودی کے بھی قائل تھے۔

استشہاد کے طور پر امام ربانیؒ کے ایک مکتوب کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے تا کہ صورت حال بخوبی واضح ہو جائے۔ فرماتے ہیں:

مشائخ طریقت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے تین گروہ ہیں:

ا۔ پہلا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ کائناتِ عالم حق تعالیٰ کی ایجاد سے خارج میں موجود ہے۔ یہ بزرگ گروہ اپنے تمام اعتقاداتِ کلامیہ میں، جو کتاب وسنت اور اجماع کے موافق ثابت شدہ ہیں، علماء اہل سنت وجماعت کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے اور متکلمین اور ان کے درمیان سوائے اس کے اور کچھ فرق نہیں کہ متکلمین اس معنی کو علمی اور استدلالی طور پر جانتے ہیں اور یہ بزرگ کشف وذوق کی بنیاد پر سمجھتے ہیں۔ اس گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال متابعت کے باعث ممکن کے تمام مراتب کو واجب سے جدا کر دیا اور کلمہ ''لا'' کے تحت لا کر سب کی نفی کر دی اور انہوں نے واجب کے ساتھ ممکن کی کوئی مناسبت نہیں دیکھی؛ سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو عاجز بندہ، مخلوق جانا اور اس عزّ شانہ کو اپنا خالق اور مولیٰ سمجھا۔

خود کا مولیٰ کا عین جاننا یا اس کا ظل اور سایہ سمجھنا، ان بزرگوں پر بہت گراں اور دشوار ہے: ما للتراب و رب الأرباب!!

۲۔ دوسرا گروہ عالم کو حق سبحانہ وتعالیٰ کا ظل جانتا ہے مگر یہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم خارج میں اصالت کے طریقے پر نہیں بلکہ ظلیت کے طریقے پر موجود ہے اور اس کا وجود حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود سے قائم ہے۔ جس طرح کے ظل اپنے اصل کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اس گروہ نے اگرچہ ممکن کے مراتب کو مبدأ سے جدا کر دیا اور کلمہ ''لا'' کے تحت لا کر اس کی نفی بھی کی۔ لیکن ظلیت اور اصالت کے واسطہ سے کچھ چیزیں ان کے وجود کے بقا کے ساتھ ثابت رہی۔ چونکہ ظل کا اصل کے ساتھ تعلق بڑا قوی ہے، اس لیے یہ نسبت ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکی۔ (دوسرے گروہ میں توحید شہودی یا شہود یہ ظلیہ کے نظریے کا اظہار ہے)

۳۔ تیسرا گروہ وحدت وجود کا قائل ہے یعنی خارج میں صرف ایک موجود ہے اور بس، اور وہ صرف ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور عالم کا خارجی طور پر علمی ثبوت کے علاوہ ہرگز کوئی ثبوت نہیں اور کہتے ہیں: الأعیان ما شمّت رائحة الوجود اگرچہ یہ جماعت بھی عالم کو حق سبحانہ وتعالیٰ کا ظل کہتی ہے۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہتی ہے کہ ان چیزوں کا وجود صرف حس کے مرتبہ میں ہے ورنہ نفس الامر اور خارج میں عدم محض ہے۔ جیسے نقطہ جوالہ سے دائرہ موھومہ؛ صرف حس کے مرتبہ میں ہے خارج میں معدوم ہے۔ اگرچہ یہ گروہ بھی اپنے درجاتِ وصل وکمال میں تفاوت کے باوجود، واصل وکامل ہیں۔ لیکن ان کی ایسی باتیں مخلوق کو گمراہی، الحاد اور بے دینی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ گروہ ممکن کے بعض مراتب کو اگرچہ مبدأ اور واجب سے جدا کر سکا ہے لیکن تمام مراتبِ ممکن کو واجب سے جدا نہیں کر سکا ہے۔ خود کو علمی جاننا، خارجی نہ جاننا، مولیٰ کا عین جاننا، اسی کوتاہ نظری کے باعث ہے۔ (یہ نظریہ توحید وجودی والوں کا ہے)

ان تین گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد امام ربانیؒ اپنے سلوک کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ درویش بچپن کے زمانے سے ہی توحید وجودی کا علم یقین کی حد تک رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کا حال نہ رکھتا تھا اور جب راہ سلوک میں آیا۔ تو حضرت پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ کی برکت سے توحیدِ وجودی منکشف ہوئی۔ مدتوں بلکہ سالوں اسی مقام کے درجات میں گشت کرتا رہا حتی کہ اسی سکر کی حالت میں کفر و ایمان زلف و روئے آں پری زیبائی است والی مشہور رباعی اپنے مرشد کو مکتوب میں تحریر کی۔ تا آنکہ حضرت حق جل مجدہ کی عنایت نے دستگیری کی اور یہ نسبت زائل ہونے لگی۔ اس کے زائل ہوتے وقت یہ درویش بڑا بے قرار ہوا کہ مجھے اس مقام سے نہ نکالیں، کیونکہ بہت سے مشائخ عظام اسی مقام میں اقامت پزیر تھے۔ لیکن اس مقام سے نکال کر مقامِ ظلیت یا توحیدِ شہودی کے مقام پر لے گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا مرتبہ پست سے بھی پست تر تھا۔ چنانچہ اس مقام پر خود کو اور عالم کو حضرتِ حق کا ظل محسوس کیا۔ اس مقام پر خواہش پیدا ہوئی کہ اس مقام سے نہ نکالا جاؤں۔ کیونکہ یہ مقام بھی توحید وجودی سے کسی قدر مناسبت رکھتا تھا۔ لیکن بالآخر کمال مہربانی سے اس مقام سے بھی بالا لے جا کر مقام عبدیت میں پہنچا دیا اور عبدیت کا کمال ظاہر ہوا اور پہلے مقامات، توحیدِ وجودی و شہودی کی پستی ظاہر ہوئی اور ان مقامات سے تائب ہو کر استغفار کی!!''

امام ربانیؒ کے علوم ومعارف ومقامات عالیہ تک یقیناً بہت کم کسی کی رسائی ہوئی ہے:

قیامت میکنی سعدی بدیں شیریں سخن گفتن مسلّم نیست طوطی را بدورانت شکر خائی

امام ربانیؒ کے اس صحیح صریح اور فیصلہ کن روشن واضح مکتوب کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ عرصہ چار سو (۴۰۰) سال سے

اختلاف ونزاع کرنے والے، امام ربانیؒ کو ابھی تک توحید شہودی کا قائل اور توحید وجودی کا منکر کہتے آ رہے ہیں اور ان کے اصلی نظریات اور مقامات بتانے سے ہچکچا رہے ہیں۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!! حق یہ ہے جیسا کہ قبل ازیں بھی بندہ ذکر کر چکا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ نے اپنی خصوصی تربیت سے دوسرے ہزار سال کے مجدد بنانے کے لیے امام ربانیؒ کی جس نہج پر تربیت فرما کر کمالاتِ نبوت اور اس سے بھی بالاتر مقامات پر امام ربانیؒ کو پہنچایا ہے۔ بعد میں آنے والے اکثر مشائخ کی ان مقامات تک رسائی نہیں ہو سکی۔ کمالاتِ ولایت رکھنے کی وجہ سے اتحاد یا ظلیت کی نسبت ان سے منقطع نہیں ہو سکی۔ چنانچہ ان مشائخ کے جذباتی اور ناسمجھ معتقدین ان کے نظریات کی تقویت کے لیے استشہاد کے طور پر امام ربانیؒ اور شیخ اکبرؒ کو درمیان میں لا کر فضاء کو تلخ بناتے رہے ہیں۔ فیا للعجب!!

امام وقت حضرت خواجہؒ نے بالمشافہہ توحیدِ وجودی و شہودی کی بحث کے دوران یہ قصہ کم نصیب کو سنایا کہ امام الہند شاہ ولی اللہؒ، امام ربانیؒ کے توحیدِ وجودی و شہودی پر تحریر فرمودہ ایک مکتوب کو سمجھنے کے لیے خانقاہ مظہریہ میں شیخ وقت مرزا مظہر جانجاناںؒ کے پاس تشریف لائے۔ مرزا صاحبؒ عمر میں شاہ صاحبؒ سے تین سال بڑے تھے اور شاہ صاحبؒ کا ان کے بارے میں اعتقاد، مضمون کے شروع میں بندہ نے تحریر کر دیا ہے۔ خیر مرزا صاحبؒ نے مکتوب سمجھا دیا۔ شاہ صاحبؒ تشریف لے گئے۔ رات کو امام ربانیؒ روحانی طور پر مرزا صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ شاہ صاحبؒ پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکے۔ کل خود ان کے ہاں جا کر اچھی طرح سمجھا کر ان کی خلش دور کر کے ان کو اطمینان دلائیں۔ چنانچہ مرزا صاحبؒ حسبِ حکم تشریف لے گئے اور مزید وضاحت فرما دی۔

چند ساتھیوں کے اصرار پر بندہ نے توحیدِ وجودی و شہودی کے موضوع پر جتنا کچھ تحریر کیا ہے؛ میرے خیال میں ذوق، شوق اور بصیرت رکھنے والوں کے لیے سرِ دست اتنا ہی کافی ہے اور نہ سمجھنے کی نیت رکھنے والوں کے لیے شاید دفتروں کے دفتر بھی بے کار ہوں۔

بس کنم خود زیرکاں را ایں بس است

امام وقت حضرت خواجہؒ کے گزشتہ مکتوب کے عرصہ بعد بندہ نے مزید کچھ استفسارات بذریعہ خط حضرت خواجہؒ سے کیے تو حضرت خواجہؒ نے یہ مکتوب جواباً تحریر فرمایا۔ یہ بھی من وعن نقل کیا جا رہا ہے:

''مکرم ومحترم مولانا رشید الحق صاحب! مطالعہ فرماویں کہ سفرِ حج سے واپسی کے بعد آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ واپسی کے بعد سفر کی تھکان اور احباب کی کثرت سے آمد ورفت نے ڈاک دیکھنے کا موقعہ نہ دیا۔ بعد میں دیگر مصروفیات نے گھیر لیا۔ تا آنکہ (ربوہ) صدیق آباد کانفرنس کا وقت آ گیا۔ وہاں کانفرنس کے موقعہ پر کسی صاحب نے ایک لفافہ ہاتھ دے دیا۔ وہ لفافہ ہفتہ عشرہ کے بعد کھولنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس فقیر کو ایسی ایسی مصروفیتوں سے اچانک اور بے ارادہ واسطہ پڑ جاتا ہے کہ جس کا وہم وگمان نہیں ہوتا۔ بہر حال آپ کے گرامی نامے ایسے ویسے تو تھے نہیں، کہ قلم برداشتہ جواب لکھ دیا جاتا؛ اس لیے جواب میں تاخیر ہوتی رہی۔

آپ نے صدیق آباد ملنے والے گرامی نامہ میں فقیر کے ایک ساتھی کا ذکر کیا ہے؛ ان کے جواب اور مضمون کو ذہن میں نہ رکھیں۔ عفو اور درگزر ہی بہتر ہے۔ آپ کے گرامی نامہ میں والدہ مرحومہ کے انتقال کا درج تھا۔ جس سے افسوس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ پاک مرحومہ کی مغفرت فرماویں اور ان کو اپنی قبر میں جنت کی آسائشیں اور

راحتیں عطا فرماوے اور آپ سب کو اس صدمے کا اجر عظیم عطا فرماویں اور صبر وسکون کرامت فرماوے۔ آمین

ا۔ حضراتِ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم کے ہاں اور فقیر کے خیال میں جملہ صوفیائے عظامؒ کے ہاں قوتِ متخیلہ کوئی چیز نہیں۔ یہ معقولیوں کی وضع کردہ ایک اصطلاح ہے۔ شریعت مطہرہ اور حضرات صوفیائے کرام کے ہاں فہم وادراک کے دو محل، جسدِ عنصری میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے پیش نظر مقرر فرمائے ہیں۔ ایک قلب اور دوسرا نفس۔ لہٰذا شریعتِ مطہرہ میں قلب کی کیفیت تصدیق، اذعان، یقین کے طور پر آتے ہیں اور نفس کے متعلق بھی امّارہ، لوّامہ اور مطمئنہ کے الفاظ سے اس کی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ ان دو محل فہم وادراک میں اوّلیت قلب کو حاصل ہے اور نفس ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

لہٰذا مشائخ عظام حضرات نقشبندیہ مجددیہ نے خطرات ووساوس کا محل پہلے قلب کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا فرماتے ہیں کہ اول اول خطرات ووساوس کا محل قلب کا جوف ہے۔ ذکر واذکار کی برکت سے اور اپنے شیخ کی توجہات کی بدولت خطرات ووساوس جوفِ قلب سے ہٹ جاتے ہیں اور قلب پر وارد ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ پھر قلب سے ہٹ کر حوالیِ قلب پر آتے ہیں۔ پھر یہ خطرات ووساوس دماغ پر وارد ہوتے ہیں۔ یہی دماغ، نفس کا محل ہے۔ پھر محنت اور ریاضت اور ذکر کی برکت سے خطرات ووساوس دماغ سے بھی مرتفع ہوجاتے ہیں۔ پھر کہاں وارد ہوتے ہیں؟! یہ مسئلہ بڑا معرکۃ الآراء ہے۔ کیونکہ انسان جب تک بشریت کے لباس میں رہتا ہے؛ خطرات ووساوس کا وارد ہونا لازمی ہوتا ہے۔ ذکر واذکار کی برکت اور شیخ کی توجہات اور ریاضت ومجاہدہ کے ثمرات میں خطرات ووساوس کا محل بدلتا رہتا ہے اور ان کے موذی اثرات سے انسان ذاکر وسالک محفوظ رہتا ہے۔

سالک جب ذکر واذکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور جب سالک کا باطن ذکر الٰہی سے مانوس ہوجاتا ہے تو پہلے ذکر کے دوران سالک پر عدمیت کی کیفیت وارد ہوتی ہے۔ اس عدمیت کا مطلب یہ ہے کہ سالک اپنے آپ کو اور اپنے وجود کو معدوم محسوس کرتا ہے۔ جب ذکر کے دوران یہ کیفیت وارد ہو تو اس وقت سالک ذکر بند کردے اور اس کیفیت کی طرف متوجہ رہے۔ جب یہ کیفیت چلی جائے تو پھر ذکر شروع کردے۔ ابتداءً یہ کیفیت لمحوں کی صورت میں آتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھنی شروع ہوجاتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سالک ہمہ وقت اپنے آپ کو معدوم پاتا ہے۔ اس کیفیت کو عدمیت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

اس کے بعد تجلی فعلی کا ورود ہوتا ہے۔ تجلی فعلی کا مطلب یہ ہے: اپنے فعل وہر حرکت کو اور عمل کو سالک اپنی طرف منسوب نہیں کرتا۔ جب اس کیفیت کو پختگی حاصل ہوتی ہے تو اس کے بعد وساوس وخطرات میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وساوس وخطرات قلب سے بالکل مرتفع ہوجاتے ہیں اور فنائے قلب کے اثرات شروع ہوجاتے ہیں۔ فنائے قلب کے رسوخ کے لیے ''مدت مدیدۃ'' درکار ہے جیسا کہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ کا ارشاد آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ بہرحال فنائے قلب کے لیے حضور ویادداشت لازمی ہے اور ان کے بغیر فنائے قلب متصور نہیں۔

۲۔ فنائے نفس تو تمام لطائف کی فنا کو متضمن ہے۔ یہ صحیح ہے، لیکن فنائے قلب بغیر فنائے نفس کے متصور ہے۔ لیکن صرف لطائف کے ذاکر ہوجانے سے فنا متصور نہیں ہوتی۔ لطائف عشرہ کے بعد مشائخ عظامؒ نفی واثبات کا ذکر کراتے ہیں۔ اس کے بعد ولایتِ صغریٰ کے مراقبات شروع کرواتے ہیں۔ ان مراقبات کے دوران فنائے قلب کا عمل بھی ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ انعام فرماتے ہیں۔ ذکر واذکار کے نتیجہ میں جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہوتا ہے وہ

وہبی ہے۔البتہ اس کے ذرائع کسبی ہیں۔بعض سالکین کو ذکر واذکار کرتے کرتے مدتیں گزر جاتی ہیں کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ایسے سالکین کے لیےان کا شیخ اگر صاحبِ کشف ہے،تو وہ شیخ اپنی صوابدید کے مطابق تربیت کرتا ہے۔

۳۔حضرت مرزامظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان کہ:سلوکِ مقامات عنقریب مسدود ہوجاوے گا!! اس کا مطلب حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لیا ہے کہ یہ فرمان اپنے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ حضرت مرزامظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین ہے اور اپنے دور میں اس سلسلے کے امام ہیں اور تمام ممالک اسلامیہ میں حضرت کے خلفاء موجود رہے ہیں اور ہندوستان میں اُس دور میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم پلہ کوئی شیخ نہیں تھا۔اس کے باوجود حضرت شاہ غلام علی شاہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بدانکہ ایں ولایاتِ ثلاثہ وایں کمالاتِ ثلثہ وحقائقِ سبعہ ودیگر مقامات، ہمہ متوسلان ایں خاندان شریف رامیسر نیست۔بعضے بولایتِ کبریٰ وقلیلے بہ کمالات ثلاثہ، ونادرے بحقائق سبعہ وجز آں فائز می شود۔ازیں است کہ درحالات وتاثیرات ایں عزیزاں تفاوت ھااست کہ حالات وعلوم ہرمقام جدااست''

حضرت مرزاصاحبؒ کے کلام کا مطلب بھی یہی لیا جاسکتا ہے کہ ان مقامات کی پوری پوری تکمیل والے حضرات قلیل ہوں گے،اکثر اس راہ پر چلنے والے ان مقامات پر فائزنہیں ہونگے۔

۴۔حضرت مرزامظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان جو آپ نے تحریر فرمایا ہے: تیس سال سلوک کے اور پنتیس سال تسلیک کے گزر چکے ہیں۔ یہ فرمان حضرت نے اپنی بے نفسی کی بنا پر فرمایا ہے۔لیکن ہر مقام کے بیشمار مدارج ہیں،ممکن ہے فنائے قلب کے اعلیٰ وارفع مقامات مراد ہوں۔

۵۔''قطب''،''فرد''اور''اوتاد''وغیرہ ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ یہ تکوین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا کیا شرائط مقرر فرمائے ہوئے ہیں،فقیر کو اس کا کوئی علم نہیں۔

آپ کے سوالات معمولی اور تمہیدی نہیں، یہ بڑے مشکل سوالات ہیں۔معلوم نہیں آپ کی اس جواب سے تسلی ہوگی یا نہیں۔

''دلائل الخیرات'' کی فقیر کی طرف سے اجازت ہے۔اللہ تعالی باعث برکت کرے۔آمین۔ ہمارے مشائخ ''دلائل الخیرات'' تنہانہیں تلاوت فرماتے تھے۔ پہلے قرآن پاک کی تلاوت کی ،اس کے بعد اس روز کی ''دلائل الخیرات'' کی ایک منزل تلاوت کرلی۔ برکت کے لیے تعویذ جو یہاں معمول ہے وہ اصحاب کھف والا تعویذ ہے اور یہ تعویذ''تذکرۃ الرشید'' کے آخر میں درج ہیں۔اس کی بھی اجازت ہے اللہ تعالی باعث برکت کرے۔آمین۔آمدن میں برکت کے لیے اپنے مشائخ موسیٰ زئی شریف کا ایک درود شریف معمول ہے، وہ اپنی سہولت کے ماتحت ایک تعداد مقرر کرلیں اور اس کو ہمیشہ جاری رکھیں: ''اللّٰھم صلِّ علیٰ سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد أفضل صلواتك بعددِ معلوماتِك وبارِك وسلِّم یہ ہے۔

فقیر جواب میں تاخیر کی معافی چاہتا ہے،فقیر کی طرف سے سب کو سلام مسنون۔ والسلام''

یہ طویل پُر مغز اور دریا بکوزہ بند مکتوب،حضرت خواجہؒ نے اپنی وفات سے بائیس (۲۲) سال قبل تحریر فرمایا ہے۔
حضرت خواجہؒ نے اپنے مکتوب میں بعض سالکین کے باوجود مدت مدیدہ تک ذکر واذکار کے متاثر نہ ہونے کا ذکر فرمایا

ہے۔اس عدمِ تاثیر کے اسباب پر قدرے روشنی ڈالتا چلوں:

جیسے کہ دین و دنیا کے ہر علم وفن میں اسباب، شرائط اور موانع ہوا کرتے ہیں۔اسی طرح تصوف میں بھی بے شمار موانع ہیں۔گناہ کا مانع ہونا تو ظاہر ہے لیکن بعض عمل باوجود گناہ نہ ہونے کے، بلکہ باوجود سراسر نیکی اور خیر ہونے کے بھی مطلقاً مانع ہوتے ہیں۔چنانچہ تین آدمی اس فن میں ایسے ہیں جو پوری طرح فنِ تصوف میں ترقی نہیں کر سکتے۔فنا فی اللہ کا مقام تو ان تینوں کو بالکل حاصل نہیں ہوسکتا:

۱۔ایسا آدمی جس پر ''لطیفہ خیالیہ'' یا ''ادراکیہ'' یا ''قوتِ تمیز'' غالب ہو اور وہ ان ہی کے اشارہ پر چلتا ہو، مقام فنا فی اللہ حاصل نہیں کرسکتا؛ کیونکہ فنا فی اللہ کا مدار تقلید، اعتقاد اور عشقِ شیخ پر ہے اور ایسا آدمی اپنی خود رائی کی وجہ سے اس سے محروم رہتا ہے۔زیادہ سے زیادہ مقام صفاء حاصل کرسکتا ہے اور اصلاح یافتہ ہوسکتا ہے۔

۲۔ایسا آدمی جو کثیر المطالعہ ہو یا انہماکِ علمی رکھتا ہو، مقام فنا فی اللہ حاصل نہیں کرسکتا بلکہ ابتدائی تاثر بھی بڑی مشکل سے حاصل کرسکتا ہے۔خواہ کثرت مطالعہ اور انہماک علمی تدریس کے رنگ میں ہو یا تصنیف کے لیے یا محض شوقیہ ہو۔اسی لیے صاحبِ فن مشائخ کرام بوقتِ بیعت ایسے آدمی کے لیے مطالعہ اور کتب بینی پر پابندی لگادیتے ہیں! وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرتِ انسان عبارت ہے بہیمیت اور مَلَکیت سے۔کثرتِ مطالعہ یا انہماکِ علمی قبل از فنا سے حیوانیت میں مزید ترقی ہوتی ہے بلکہ کثرت مطالعہ علامت ہی کسی بھی شخص کے قوی الحیوانیت ہونے کی ہے۔جبکہ فنا فی اللہ، حیوانیت کے ضعیف ہوئے بغیر اور مَلَکیت کے قوی ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ فنا فی اللہ، احدیتِ صَرفہ کی طرف عرصہ دراز کی دائمی توجہ چاہتی ہے، جبکہ کثرتِ مطالعہ اس دائمی توجہ سے مانع ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے:

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدا را — آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

مشہور ہے کہ ایک شیخ الحدیث صاحب شیخ الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہونے گئے۔ساتھ ہی اپنے دو تین مقتدیوں کو بھی لے گئے۔چنانچہ حاجی صاحبؒ نے سب کو بیعت فرما کر لطیفہ قلب پر ذکر کا سبق عنایت فرمایا اور تین ماہ کرنے کا حکم دیا۔تین ماہ بعد جب سب حاضر ہوئے تو شیخ الطائفہ نے عوام الناس مقتدیوں کو دوسرا سبق عنایت فرما دیا، لیکن شیخ الحدیث صاحب کو فرمایا کہ وہی پہلا سبق کرتے رہے۔پھر تین ماہ بعد آنے کا کہا۔ظاہر ہے شیخ الحدیث صاحب نے محسوس کیا ہوگا کہ عوام آگے نکل گئے، میں پیچھے رہ گیا۔اتفاق سے تین ماہ بعد پھر اکھٹے حاضر ہوئے تو حاجی صاحبؒ نے عوام کو تیسرا سبق عنایت فرمایا اور شیخ الحدیث صاحب کو حسب سابق اسی سبق اول کا حکم دیا۔شیخ الحدیث صاحب اس دفعہ ذہنی طور پر تیار ہوکر تشریف لائے تھے کہ اگر وہی سبق ملا تو احتجاج کروں گا!! چنانچہ عرض کی کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ مجھ پر سبق نے اثر نہیں کیا؛ اسی لیے اگلا سبق نہیں ملتا۔یا تو ہر دفعہ حضرت یوں ہی فرماتے رہیں گے کہ اسی سبق کو کرو!! اور یا پھر اس عدمِ تاثر کا حل فرمائیں؟ حاجی صاحبؒ جہاندیدہ کامل العقل شیخ تھے۔ان کا رسمی عالم نہ ہونا سب کو معلوم تھا۔اس لیے بخاطر مصلحت فرمایا کہ رشید احمد کے پاس چلے جائیں۔چنانچہ شیخ الحدیث صاحب حضرت گنگوہیؒ کے پاس پہنچے۔آمد کی وجہ پوچھنے پر سارا قصہ بتا دیا۔حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ تین ماہ بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھانا موقوف رکھیں اور سبق یہی پہلا جاری رکھیں۔یہی بات حاجی صاحب بھی فرمانا چاہتے تھے، لیکن ان کے فرمانے سے مفاسد پیدا ہوسکتے تھے۔اسی لیے حضرت گنگوہیؒ کے حوالے فرمایا۔حضرت گنگوہی چونکہ خود بھی حدیث پڑھاتے تھے، ان کے فرمانے میں مفاسد نہ تھے۔چنانچہ شیخ

الحدیث صاحب اس عرصے میں ذکر سے متاثر ہونے لگے۔

غرض یہ کہ حدیث شریف خصوصاً بخاری شریف پڑھانے کے انتہائی اعلیٰ نیک عمل ہونے میں کسی کو شک وشبہ نہیں لیکن ہرفن کے اپنے اصول ہیں، انہی پر کاربند رہنا پڑتا ہے۔

۳۔ کثیر العبادۃ الظاہرۃ: ظاہری عبادت مثلاً نماز نفل، تلاوت، درود، استغفار، غرض یہ کہ لسانی اور قالبی عمل کی کثرت رکھنے والا، فنافی اللہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اسی لیے مشائخ بیعت کرنے والوں کو سوائے فرائض، واجبات اور سنن موکدہ کے تمام اعمال ظاہرہ سے منع فرمادیتے ہیں۔ سوائے ذکر کے سب عبادتیں ممنوع ہوجاتی ہیں۔

عبادت ظاہرہ اگرچہ ملکیت کو بڑھاتی ہے، لیکن یہ عبادت ظاہرہ، باطن کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے محض رسمی ہونے کی بنا پر ملکیت ضعیفہ پیدا کرسکتی ہیں۔ جبکہ فنافی اللہ کے لیے ملکیت قویہ درکار ہے اور نیز عبادات ظاہرہ اس سٹیج پر اپنے اندر مشغول رکھنے کی وجہ سے ''احدیت صرفہ'' کی طرف دائمی توجہ سے مانع ہوتی ہیں۔

بارہ تیرہ سال قبل اسلام آباد میں ایک بزرگ عالم تشریف لائے، مجھ نالائق سے ملاقات کی خواہش کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ بندہ نے ظہر کی چائے میں دعوت دے دی۔ تشریف لائے، نحیف ونزار، سن شریف نوے (۹۰) سے تقریباً متجاوز تھا۔ معلوم ہوا کہ دیوبند کے فاضل ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں فراغت ہوئی۔ فراغت کو بھی باسٹھ تریسٹھ سال ہوچکے تھے۔ خیر باتوں باتوں میں بندہ نے روحانی نسبت کا پوچھ لیا۔ مسکرانے لگے! فرمایا کہ بیعت تو رسمی سی عرصہ دراز قبل شیخ العرب والعجم حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ سے کی تھی، لیکن ذکر سے میں ذرا بھی متاثر نہیں ہوسکا۔ بندہ نے عرض کی کہ اپنے شیخ سے رابطہ کرکے عرض کردیتے۔ فرمایا کہ وہ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے؛ البتہ کافی عرصہ بعد حج پر جانا ہوا تو وہاں عرض بھی کردی کہ میں ذکر سے متاثر نہیں ہوسکا۔ حضرت نے شفقت فرمائی اور رات کو اپنے حجرہ خاص میں ٹھہرنے کا فرمایا۔ خصوصی توجہ بھی فرمائی اور رات کو اپنی خاص چارپائی پر سونے کا فرمایا، لیکن دونوں باتوں سے میں متاثر نہ ہوسکا! صبح عرض کرنے پر دوبارہ توجہ فرمائی، لیکن بے سود؛ چنانچہ بندہ نامراد واپس ہونے لگا، تو فرمایا کہ پوری زندگی میں دو آدمی میری توجہات سے متاثر نہیں ہوسکے۔ ایک ''تم'' اور دوسرا ''کوئی اور''۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ بہت عبادت گزار تھا۔

بندہ راقم الحروف نے عرض کی کہ آپ کے عدم تاثیر کی کوئی وجہ بیان نہیں فرمائی؟ کہنے لگے نہیں۔ میں نے عرض کی کہ وہ وجہ میں بیان کردوں؟!! فرمانے لگے: ضرور بیان کریں۔ بندہ نے عرض کی کہ آپ کثیر المطالعہ ہیں۔ مولانا باوجود نحیف ونزار بوڑھے ہونے کے اچھا خاصا اچھل پڑے! اور فرمایا کہ اوہو! میں تو واقعی کتابی کیڑا ہوں!! میری ساری زندگی اسی مطالعے میں ہی گزر گئی ہے اور لوگ بھی مجھے کتابی کیڑا ہی کہتے ہیں۔

غرضیکہ بہت سے اچھے کام بھی اس لائن کے موانع میں سے ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ تینوں آدمیوں میں سے اوّل الذکر مطلقاً فنافی اللہ کی استعداد نہیں رکھتا، لیکن کثیر المطالعہ وکثیر العبادۃ عرصہ دراز تک علی حسب الاستعداد والریاضۃ ان کاموں کو چھوڑنے سے استعداد حاصل کرسکتے ہیں۔ کہیں مولویان کرام مجھ نالائق پر فتویٰ ہی نہ جڑ دیں کہ یہ امت کو کدھر لے جارہا ہے!! خدانخواستہ ایسی بات نہیں۔ میں تو ذکر وفکر کی محنت کے تھوڑے عرصے میں رنگ لانے کا اصول بیان کررہا ہوں تاکہ:

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابی بسیار

کا مصداق نہ بنے!!

اگر لوگ خفا نہ ہوں تو خدا لگتی کہہ دوں: کہ تمام انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اور انکے برگزیدہ اصحاب کرام کی نسبت کی بلندی کی ایک خاص وجہ مطالعہ اور اسباب مطالعہ کا فقدان تھا۔ وہاں تو سراسر عمل، اخلاص، روحانیت تھی۔

حاصل کلام یہ کہ فنا فی اللہ سے قبل کثرت مطالعہ وعبادۃ ظاہرہ موانع میں سے ہیں۔ ہاں! ایسا آدمی جو فنا وبقا حاصل کر چکا ہو، اس کو کثرتِ مطالعہ کتبِ شریعہ خصوصاً کتبِ حدیث وتفسیر کا مطالعہ، اسی طرح عبادۃ ظاہرہ کی کثرت بھی سراسر ترقی بخش ہے۔ غرض یہ کہ ''جائے استاد خالی است'' کے بموجب ہر فن استاد سے ہی سیکھنا پڑتا ہے اور یہ اصول وضوابط کے تحت ہی ہوسکتا ہے۔

حضرت خواجہؒ نے آخری خط اپنی وفات سے دس سال قبل مجھ نالائق کو تحریر فرمایا۔ بندہ ایک دفعہ اپنے شاگردِ خاص مرید ِخاص مولوی نیاز احمد شاہ صاحب سے اس کی مسلسل نالائقیوں کی وجہ سے ناراض ہوا اور مجلس میں حاضر ہونے پر پابندی لگا دی۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے حضرت خواجہؒ کے دامن عاطفت سے سفارش چاہی تو حضرت خواجہؒ نے اس کی عرض قبول فرماتے ہوئے مجھ نالائق کو مکتوب تحریر فرمایا۔ اس مکتوب کے وقت یہ نالائق اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود، عرفِ عام میں چونکہ ''شیخ صاحب'' کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس لیے حضرت خواجہؒ نے اسی عرف کا لحاظ فرماتے ہوئے اسی لقب سے یاد فرمایا ہے۔ خط کیا ہے، باوجود اختصار کے ''ہم نے ہر ادنی کو اعلی کر دیا'' کا مکمل عکاس ہے؛ من وعن نقل کیا جا رہا ہے:

''بگرامی خدمت جناب محترم شیخ صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سلام مسنون کے بعد گزارش ہے کہ حامل رقیمہ ہذا نیاز علی شاہ صاحب جناب کے مخلص خادم حاضر ہو رہے ہیں۔ اپنی شفقتوں سے اُن کو سرفراز فرماویں۔ اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرماویں گے اور فقیر دل وجان سے شکر گزار ہوگا۔''

ان آخری دس سالوں میں حضرت خواجہؒ نے رفتہ رفتہ اپنی پیرانہ سالی کمزوری اور بیماری کی بنا پر خط وکتابت ترک فرما دی تھی۔ ورنہ بہت ساری اہم فنی باتیں پوچھنے کے قابل تھیں۔ جن کا جواب صرف حضرت خواجہؒ ہی عنایت فرما سکتے تھے: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ اور ساتھ ہی خاموشی بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ تجلیات عالیہ عظیمہ کی بنا پر، باوجود شفیق ہونے کے ہیبت وجلال محسوس ہونیکی بنا پر زبانی بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہوسکتی تھی۔

پیش جاناں قوت گفتار بودے کاشکے

سانحۂ وفات

حضرت خواجہؒ کی وفات سے دو دن قبل بندہ نے ایک خواب دیکھا: دفعۃً ذہن حضرت خواجہؒ کی وفات کی طرف منتقل ہوا۔ دل دھک سے رہ گیا!! فوراً خانقاہ شریفہ رابطہ کیا لیکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ اسلام آباد میں حضرت کے میزبان حاجی یعقوب صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت واقعی بیمار ہیں اور ملتان میں سیال کلینک میں زیر علاج ہیں۔ اعتقادِ روحانی بھی عجیب چیز ہے!! بندہ نے خواب اور اپنی پریشانی کا ابھی تک کسی سے اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ کہ اُسی رات بقول معتقدین: بندہ نے ایک قریبی مرید ومعتقد کو خواب میں بتایا کہ حضرت خواجہؒ وفات پا چکے ہیں! دیکھنا جنازے سے رہ نہ جانا۔ جبکہ دوسرے معتقد کو کہا: کہ تین بجے جنازہ ہے، سب ساتھیوں کو بتا دو اور سب جنازے پر پہنچنے کی فکر کریں اور بندہ کے ایک مرید کو جو بیرون ملک

قیام پذیر تھا؛ حضرت خواجہؒ نے خود خواب میں فرمایا: کہ میں ایک ہفتے بعد وفات پا رہا ہوں جنازہ پر پہنچنا: چنانچہ وہ ہفتے بعد بدھ کی شام لاہور ائر پورٹ پر پہنچا اور اگلے دن سیدھا جنازہ پر حاضر ہوا۔ سچ ہے:

ما شما را بہانہ ساختند

چنانچہ خواب کے دو دن بعد شام کو کھانے کے بعد مدرسہ کے مدرس قاری زاہد صاحب نے اپنا موبائل فون بندہ کے سامنے کر دیا۔ جس میں امام وقت حضرت خواجہؒ کی وفات کی وحشت ناک خبر تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دنیا کے طول و عرض میں یہ خبر سب معتقدین پر بجلی بن کر گری۔ لیکن چونکہ آنحضرت جل سلطانہ کا نظام ہی ایسا ہے صبر کے بغیر کوئی چارہ نہیں!!

خنک روزے بود یا بیم اگر خضر ہدایت را   کہ راہوارِ یقین ما بصحرائے گمان گم شد

اگلے دن احباب کے ساتھ جنازے پر حاضر ہوا تو انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ''عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' کا سماں پیش کر رہا تھا۔ جنازے کے بعد بچشم گریاں و دل بریاں سر پر خاکِ محرومی ڈالتے ہوئے واپسی ہوئی۔ حیات عنصری میں اب شوقِ دیدار ہمیشہ بے کل ہی رکھے گا!!

مئے وصل نیست وحشی بخمارِ ہجر خو کن   کہ شرابِ نا امیدی غم دردِ سر ندارد

حضرت خواجہؒ کی وفات و حسرتِ آیات سے عالمِ اسلام کا اتنا بڑا عظیم نقصان ہوا ہے، کہ قطع نظر رسمی الفاظ کے عالمِ اسباب میں اس کی تلافی یقیناً ناممکن ہے۔ حضرت حق جل مجدہ حضرت خواجہؒ کے ساتھ یقیناً ان کے شایانِ شان سلوک فرمائیں گے اور مقعدِ صدق کے مقامِ عالی سے سرفراز فرمائیں گے۔ ہم پسماندوں کو حضرتِ حق، حضرت خواجہؒ کی نسبت کے طفیل اپنے قرب و معرفت سے بہرہ ور فرمائیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین

مکاشفہ

حضرت خواجہؒ کی وفات کے دو چار دن بعد راقم الحروف کے ایک قریبی صاحب کشف مرید و معتقد نے مکاشفہ میں دیکھا: کہ راقم الحروف نے حضرت خواجہؒ سے پوچھا کہ حضور برزخ میں کیسی رہی؟ تو حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ خلاف توقع رہی۔ میرا خیال تھا کہ قبر میں حسب معمول مجھ سے سوال وغیرہ ہوگا؛ لیکن قبر میں ڈالے جانے کے ساتھ ہی قبر تا حد نگاہ فراخ ہوگئی۔ جنت کی کھڑکی کھول دی گئی۔ منکر نکیر کی بجائے دو فرشتے بطور خادم کے بھیجے گئے کہ جو خدمت ہو، ان سے فرما دیں، بجا لائی جائی گی۔ تمام مشائخ کرامؒ نے میرا استقبال کیا اور خاص ''لے'' میں سب نے میرے آنے کی خوشی میں اسم ذات کا جہری ذکر کیا، اور میری آمد پر برزخ میں مشائخ نے تین دن جشن خوشی منایا۔ تین دن کے جشن کے بعد خواجہ کائنات حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دربار عالی میں بلایا، میں حاضر ہوا؛ تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ختم نبوت کے کام کے طفیل مجھ پر توقع سے زیادہ عنایات فرمائیں اور اب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی ہوتا ہوں۔

کشف و کشوف اگر چہ کوئی شرعی حجت نہیں، لیکن اس میں کوئی بات خلاف شرع بھی نہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ یقیناً ایسا ہی بلکہ اس سے بھی بہت اعلیٰ معاملہ حضرت حق جل مجدہ نے حضرت خواجہؒ کے ساتھ فرمایا ہوگا۔ آنحضرت جل سلطانہ ہمیں حضرت خواجہؒ کی ہمہ قسم، خصوصی طور پر روحانی برکات دائمی طور پر نصیب فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین والحمد للہ رب العالمین۔

مباحثہ ومکالمہ

محمد زاہد صدیق مغل*

* نیشنل یونی ورسٹی فاسٹ، کراچی۔ zahid_12feb@yahoo.com

اسلامی بینکاری: زاویہ نگاہ کی بحث (۲)

☆ **اسلامی بینکاری بطور حکمت عملی اور انداز فکر:** پھر اسلامی بینکاری کے نام پر جس شے کو 'تبدیلی کی حکمت عملی' کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے اس کی نوعیت پر غور کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس بحث سے یہ اندازہ لگانا بھی ممکن ہو جائے گا کہ آیا اسلامی بینکاری کو فروغ دینے والے حضرات بذات خود اسے مجبوری سمجھتے بھی ہیں یا نہیں نیز اس کے ذریعے وہ کس نوع کی تبدیلی کی توقع رکھتے ہیں۔ کسی موجود نظام میں تبدیلی کے لیے برپا کی جانے جدوجہد کو حکمت عملی کے تین ادوار پر تقسیم کر کے سمجھا جا سکتا ہے، short run, middle run and long run (قریب یا قلیل، وسط اور طویل مدتی)۔ ان میں سے ہر دور کی حکمت عملی کے اپنے جداگانہ تقاضے ہیں:

- **طویل مدت (Long Run):** حکمت عملی سے متعلق یہ وہ دور ہے کہ جس کے بارے میں آپ اپنی حتمی منزل کا تعین کرتے ہیں کہ آپ بالآخر کن مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی طویل دور سے مراد وہ مقام ہے جہاں آپ اپنی قلیل اور وسط مدت میں اختیار کردہ طرز عمل و فیصلوں کے نتیجے میں پہنچنے کی امید کرتے ہیں۔ طویل مدت کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ اس کے بارے میں حتمی مقاصد کے بیان اور ایک عمومی خاکے سے زیادہ کوئی بات طے کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے، یعنی یہ بات قابل از وقت طے نہیں کی جا سکتی کہ طویل مدتی معاشرتی و ریاستی صف بندی کیسی ہوگی کیونکہ اداری صف بندیاں افراد کے تعلقات کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہیں جن پر ان گنت عوامل اثر انداز ہوتے ہیں

- **قلیل مدت (Short Run):** نظاماتی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والی تحریکات کے لیے اپنی واقعیت کے اعتبار سے یہ اہم ترین دور ہوتا ہے کیونکہ عوام کی اکثریت دور اندیش نہیں ہوتی اور وہ اسی دور میں زندہ رہتی ہے۔ قلیل مدت سے مراد وہ فیصلے ہیں جو ہمیں فوری یعنی 'آج' اور 'ابھی' کرنے ہیں۔ مثلاً کیا اس سال ہمیں الیکشن میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں، اگر ہاں تو کسی پارٹی کے ساتھ مل کر یا اپنے طور پر، بینکاری نظام کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے، ہمیں اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کرنی چاہیے یا اسلحہ اٹھا لینا چاہیے وغیرہ وغیرہ اور اس نوع کے بے شمار فیصلے، اہم بات یہ کہ ان امور کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرنا بھی بذات خود ایک فیصلہ ہے۔ عام لفظوں میں اس دور کو پنجابی زبان کے محاورے 'ہن کی کریئے' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قلیل مدت فیصلوں کی نوعیت سمجھنے کے لیے اس سے متعلق دو خصوصیات

ذہن نشیں رہنا چاہئیں: اول یہ وہ دور ہے جہاں ہم اپنی واقعیت اور ماحول (facticity and environment) پر اثر انداز ہو کر اسے تبدیل نہیں کر سکتے، بلکہ وہ ایک حقیقت واقعہ کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے اور ہمیں اس موجود ماحول کے اندر رہتے ہوئے ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ دوئم یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہم ہمیشہ 'کم تر شر' کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دو افراد یا تحریکات کے درمیان اپنے اپنے زاویہ نگاہ کی بناء پر اس امر میں تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ فی الحال 'چھوٹی برائی' کیا شے ہے مگر یہ بات طے ہے کہ دونوں اپنے تئیں 'کم تر شر' ہی کو اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

- **وسط مدت (Middle Run)**: طویل مدت مقاصد کے حصول اور اپنی نتیجہ خیزی کے اعتبار سے یہی دور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وسط مدت حکمت عملی کے اہم مراحل میں موجود نظام کے جبر کو کم کرنے کے لیے افراد کی مسلسل تعلیم و تربیت (جسے نئے سیاسی شعور سے تعبیر کر سکتے ہیں) اور متبادل اداراتی صف بندی (جسے تحریکی عمل بھی کہہ سکتے ہیں) کو وجود میں لانا شامل ہے۔ یہ وہ دور ہے جہاں اپنے فیصلوں کے ذریعے ہم ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وسط مدت حکمت عملی میں فیصلہ کرنے کے اصول قلیل مدت سے متضاد ہوتے ہیں، یعنی اگر قلیل مدت میں ہم سمجھوتے پر مبنی فیصلے کرتے ہیں تو وسط مدتی حکمت عملی میں سمجھوتوں پر مبنی فیصلے کبھی نہیں کیے جاتے، بلکہ ان فیصلوں کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ انکا مطمع نظر اپنی واقعیت اور ماحول کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام ادوار میں تعلق یہ ہے کہ قلیل مدت میں ایسے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں جن کے بعد وسط مدتی حکمت عملی پر عمل کرنا ہی ناممکن ہوتا چلا جائے اور بالآخر آپ نظام تبدیل کرنے کی پوزیشن ہی میں نہ رہیں بلکہ اس سے علی الرغم خود کو اسی نظام میں سمو لیں۔

پھر حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ کسی حاضر و موجود شے کو اختیار کرتے وقت اس کے ساتھ دو قسم کا رویہ اپنانا ممکن ہے: اول آئیڈیل سمجھنے کا اور دوسرا Strategization یعنی بطور حکمت عملی اسے حتمی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کا۔ کسی شے کو بطور آئیڈیل اور بطور Strategy استعمال کرنے سے دو مختلف قسم کا فکری لٹریچر اور طرز عمل وجود میں آتا ہے۔ اول الذکر رویے کے بعد اس اختیار کردہ شے کو اپناتے (own کرتے) ہوئے اسے ایک مقصد کے طور پر فروغ دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف کسی انقلابی تبدیلی کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی، جبکہ دوسرے طرز عمل میں کسی شے کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ بالآخر اسکی ضرورت ہی ختم ہو جائے، نہ یہ کہ وہ ہماری زندگی کا لازمی جزو بن جائے۔ مثلاً افغان جہاد میں امریکہ نے مجاہدین کے ساتھ جو تعلق استوار کیا وہ دوسری نوعیت کا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد امریکہ نے جہاد کی تعلیم اور مجاہدین کے مالی مسائل کے حل اور ان کی تربیت کرنے والے اداروں کے فروغ کے لیے دنیا بھر میں کوئی جال نہیں بچھا دیا بلکہ بذات خود انہیں مٹانے کے درپے ہو گیا۔

حکمت عملی کے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ذرا اسلامی بینکاری کا جائزہ لیجئے۔ ماہرین اسلامی بینکاری کے نزدیک اس کے طویل مدتی مقاصد کیا ہیں یہ جاننے کے لیے انکے فکری لٹریچر کا مطالعہ بہت کافی ہے جس سے یہ بات عین روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام بھی ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے جنہیں موجودہ نظام اصل قرار دیتا ہے (اسی لیے یہ حضرات بینکنگ کا متبادل پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے متبادل کہتے ہی اسے ہیں جو ایک ہی مقصد کو کسی دوسرے طریقے یا ذریعے سے حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو)۔ ماہرین اسلامی معاشیات کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ مارکیٹ اکانومی پر مبنی موجودہ نظام اور اس کے مقاصد فطری انسانی تقاضوں کا جائز ارتقا ہیں، البتہ اس

نظام میں چند عملی (operational) مگر قابل اصلاح نوعیت کی خرابیاں بھی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر یہ مقدمہ ومفروضہ مان لیا جائے تو پھر موجودہ نظام کے خلاف ہر قسم کی انقلابی (ریاست کے اندر تعمیر ریاست) اسلامی جدوجہد کا جواز کالعدم ٹھہرتا ہے کیونکہ اس بنیادی مقدمے کے بعد ان عملی خرابیوں کی اصلاح کے لیے کسی انقلابی جدوجہد نہیں بلکہ اصلاحی سیاست (reformist politics) وسرمایہ دارانہ علوم یعنی سائنسز (بشمول سوشل اور بزنس) میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت رہ جاتی ہے، اور درحقیقت یہی ماہرین اسلامی معاشیات کی طویل مدت حکمت عملی ہے جسکے حصول میں وہ ہردم کوشاں ہیں اور یہ حکمت عملی انکے قلیل اور وسط مدتی تمام فیصلوں سے عین عیاں ہے (۴)۔ اسلامی معاشیات وفائنانس سے وابستہ افراد کا حتمی مطمع نظر موجودہ عالمی نظام زر کا خاتمہ نہیں بلکہ اسے فطری مان کر اس میں چند اصلاحات کا نفاذ ہے اور وہ بھی اس لیے کہ ان اصلاحات کے ذریعے سرمائے میں زیادہ بہتر انداز میں اضافہ ممکن ہوسکتا ہے [یہی وجہ ہے کہ مجوزین اس امر (جو درحقیقت ان کی 'غلط فہمی' ہے) کو فخریہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ گلوبل فائنانشل بحران میں اسلامی اصولوں پر چلنے والے بینک وغیرہ سب سے کم متاثر ہوئے، یعنی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام زر خود کو بحرانوں سے محفوظ کرسکتا ہے، فیاللعجب گویا اسلام باطل کا محافظ بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے]۔ اسلامی بینکاری، اسلامی بانڈز، اسلامی انشورنس وغیرہم کا حاصل صرف اور صرف مسلم ذرائع کو عالمی نظام زر میں شامل کرکے نفع خوری کو بڑھاوا دینا ہے۔ مجوزین اسلامی بینکاری کے نزدیک قلیل مدت جبر سے مراد محض یہ ہے کہ فی الوقت انہیں عام بینکوں کے معیار سود کو اپنے شرح نفع کے لیے بطور معیار قبول کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حکمت عملی کے درج بالا خاکے کے مطابق اسلامی بینکاری کا نقشہ کچھ یوں ہے:

- طویل مدتی حکمت عملی: موجودہ نظام زر کے مقاصد کو جائز سمجھتے ہوئے اسلامی طریقوں سے ان کا حصول۔
- وسط مدتی حکمت عملی: سرمایہ دارانہ علوم کی اسلام کاری اور اصلاحی سیاست کے ذریعے افراد کی فراہمی اور قانونی تبدیلیوں کو ممکن بنانا تاکہ اسلامی بینکاری پر بہتر طریقے سے عمل درآمد کرنا ممکن ہوسکے۔
- قلیل مدتی حکمت عملی: سودی نظام زر کے جبر کو جس حد تک کم اپنانا ممکن ہو اتنا ہی اختیار کیا جائے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اسلامی بینکاری کے حامیین اور ہمارے درمیان باعث نزاع یہی قضیہ ہے کہ وہ موجودہ نظام کی اسلام کاری کو ممکن سمجھ کر اس کے ساتھ آئیڈیل بنیادوں پر تعلق استوار کرتے ہیں اور یہی انکی حکمت عملی کی بنیادی غلطی ہے۔ ماہرین اسلامی معاشیات کی اس طویل مدتی حکمت عملی کو چند اکا دکا عبارتوں کا حوالہ دیکر ذائل کرنے کی کوشش کرنا اور یہ تاثر دینا کہ بذات خود اسلامی بینکاری کسی قلیل مدت حکمت عملی (جبر وغیرہ) کا شاخسانہ ہے دن کو رات کہنے کے مترادف ہے (جسکی ایک دلچسپ مثال ذیل میں 'خلوت وجلوت کے تضاد' کے تحت آرہی ہے)۔

☆ **خلوت وجلوت کا تضاد:** اسلامی بینکاری کے مویدین اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں اسلامی بینکاری کے حامی علمائے کرام بھی اسلامی بینکاری کے فروغ کو آئیڈیل نہیں سمجھتے بلکہ اسے مجبوری وغیرہ کے درجے میں ہی اختیار کرتے ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اکثر وبیشتر ان علماء کرام کی نجی محافل میں جب کوئی شخص ان سے سوال کرتا ہے تو تقوے کا لحاظ کرتے ہوئے اسے غیر سودی (اسلامی) بینکاری سے بچنے ہی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اسلامی بینکاری کے فروغ کے حوالے سے ان علماء کرام کی 'نجی حکمت' عملی کیا ہے یہ تو ہمیں معلوم نہیں کیونکہ اس کے لیے ثقہ وغیر ثقہ راویوں کی چھانٹ پھٹک

کرنے کا ایک پیچیدہ مرحلہ درکار ہے (ہوسکتا ہے بعض احباب کو کسی معتبر باخبر ذریعے سے ان نجی محافل کے احوال معلوم ہوتے ہوں)، مگر ان علماء کرام کی اسلامی بینکاری کے حوالے سے 'پبلک پالیسی' معلوم کرنے کے لیے کسی روایت پر اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس سلسلے میں آئے دن اسلامی بینکوں (بشمول میزان بینک) کی طرف سے اخبارات میں دیے جانے والے جاذب نگاہ اشتہارات، شہر کی اہم شاہراہوں کے کنارے آویزاں بڑے بڑے بل بورڈز اور گلیوں کوچوں میں لٹکے ہوئے خوشنما بینرز بہت کافی ہیں جن کا مقصد ہی صرف یہ ہے کہ مختلف اشتہاری ہتھکنڈے استعمال کر کے عوام الناس (علی الرغم اس سے کہ وہ بینکوں سے کوئی تعلق رکھتے ہیں یا رکھنا چاہتے بھی ہیں یا نہیں کیونکہ پاکستان کی دس فیصد سے بھی کم آبادی بینک اکاؤنٹ ہولڈر ہے) کو اسلامی بینکوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اکسایا جائے، اور یہ بات بھی کوئی راز نہیں کہ کروڑوں روپے کی اس اشتہار بازی کا مقصد آخر کیا ہوتا ہے۔ شاید یہ اپنی نوعیت کی پہلی اسلامی روایت ہوگی کہ جس شے کو خلوت میں ترک کرنے کی نصیحت کی جا رہی ہو جلوت میں عین اسی شے کو اشتہار بازی کے ذریعے عام کیا جانا مطلوب قرار پا رہا ہو۔ خلوت اور جلوت میں اختیار کردہ یہ متضاد حکمت عملی آخر تنوع کی کس قسم سے متعلق ہے یہ ہم طے کرنے سے بالکلیہ قاصر ہیں، اگر موید ین اسلامی بینکاری اس سلسلے میں راہنمائی فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ پھر کیا ہی اچھا ہو اگر ان علمائے کرام کی یہ 'نجی حکمت عملی' اور 'تقوے پر مبنی قیمتی مشورے' خفیہ روایت کے سلسلوں کے بجائے اشتہارات اور بل بورڈز کے ذریعے عوام الناس تک پہنچ جائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ماہرین اسلامی معاشیات کی اکثریت موجودہ معاشی اداراتی صف بندی میں شمولیت کو کوئی مجبوری نہیں بلکہ فطری تقاضوں کا ارتقاء سمجھتی ہے جنہیں معمولی ردوبدل کر کے اسلامی بنایا جا سکتا ہے (جیسا کہ ان حضرات کی کاوشوں اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتب کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے)۔

☆ **کیا 'کل' کی بحث شرع کے لیے اجنبی ہے؟:** مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ شریعت میں کسی شے کو اپناتے وقت 'کل' کے بجائے حرام وحلال کی بنیاد پر جانچنے کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کے اس اصول کے تجزیے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ 'کل' کی بنیاد پر جانچنے سے ہماری مراد ہے:

- موجودہ دور کے کسی بھی مظہر کا اس کے درست اور مخصوص علمی ومعاشرتی تناظر میں جائزہ لے کر اسکی حقیقت کو پہچاننا
- اس مظہر کو کسی اسلامی روایت یا تصور کے ساتھ محض ظاہری وجزوی مماثلت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کے مخصوص مقاصد اور 'مقاصد شریعت' کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس طرح پرکھنا ہے کہ
- مبادا ہم کسی ایک پہلو پر عمل کرنے کی کوشش میں شریعت کے ان گنت دیگر احکامات کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں
- نیز شریعت جس قسم کی انفرادیت، معاشرت وریاست کا فروغ چاہتی ہے وہ تار تار نہ ہو جائے

کلی تجزیئے سے ہم ہرگز یہ مطلب 'نہیں' لیتے کہ چاہے کوئی عمل قرآن وسنت سے ہی کیوں نہ ثابت ہوا گر وہ مقاصد الشریعہ کے خلاف ہوگا تو ہم اسے نہیں مانیں گے، العیاذ باللہ بھلا کیا خود شارع سے بڑھ کر بھی کوئی یہ طے کر سکتا ہے کہ اسکی عطا کردہ شریعت کے مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ خود اس کے تجویز کردہ طریقے کے سواء کوئی اور ہو سکتا ہے؟ مفتی صاحب کو راقم کے بارے میں یہ بدگمانی نجانے کس عبارت سے لاحق ہوگئی کہ ہمارا تعلق اس گروہ سے ہے جو مقاصد الشریعہ کی آڑ میں شریعت ہی کو معطل کر دینا چاہتا ہے۔ راقم ایک مرتبہ پہلے بھی ماہنامہ الشریعہ ہی میں یہ وضاحت کر چکا ہے کہ مسئلہ خیر وشر،

معروف ومنکر کی تعیین کے معاملے میں وہ ماتریدی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے اشعری نکتہ نگاہ کا قائل ہے کہ حسن وقبح افعال کے ذاتی نہیں بلکہ شرعی اوصاف ہیں نیز عقل انکا ادراک کرنے سے بالکلیہ قاصر ہے، لہذا راقم الحروف کو مقاصد الشریعہ کی آڑ میں شریعت معطل کرنے والے گروہ پر قیاس کرنا کسی طور درست نہیں۔ جہاں تک رہی یہ بات کہ مجوزین اسلامی بینکاری کے شرع سے ثابت شدہ معاہدات استعمال کرنے کو ہم مقاصد الشریعہ کے تناظر میں رد کیوں کرتے ہیں تو اس ضمن میں تین باتیں عرض ہیں:

- مجوزین جن دلائل کی بنیاد پر موجودہ اداراتی صف بندی کا اسلامی جواز پیش کرتے ہیں وہ دلائل ہی محل نظر ہیں۔ انکے اکثر و بیشتر دلائل کی حالت یہ ہے کہ ایک ہی حدیث سے علمائے متقدمین کا کوئی حوالہ پیش کیے بغیر نیز لبرل معاشیات کو درست طور پر سمجھے بغیر ہی اس نظام کو اس حدیث سے اخذ کر ڈالتے ہیں۔ انکے زیادہ تر دلائل قرآن وسنت سے براہ راست استدلال کے بجائے قیاس پر مبنی ہوتے ہیں، مثلاً کمپنی کا جواز بیت المال پر قیاس کرکے نکال لیا گیا ہے جو محض ظاہر بینی کی علامت ہے کیونکہ دونوں اپنے مقاصد کے اعتبار سے بعد المشرقین کی سی مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ قیاس بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی تاریخ میں 'تعلیمی نظام کی موجودگی' کو دیکھ کر یہ دعویٰ کرے کہ 'موجودہ تعلیم بھی ایک نظام ہے' اور یوں موجودہ علوم کو شامل اسلام کر لے (اگر راقم کو مفتی صاحب کی الزامی دلیل سے اپنا دفاع کرنا ہوتا تو اسلامی بینکاروں کی مانند اس قسم کے بے شمار قیاسات گھڑے جاسکتے ہیں)۔ ظاہر بات ہے محض نظام تعلیم کی مماثلت موجودہ تعلیم کو اسلام میں جائز کہنے کے لیے کافی نہیں کیونکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ دونوں کے مقاصد میں تعلق کیا ہے۔ ہمارے مفکرین موجودہ دور کے تقریباً ہر ہی مظہر کو کسی نہ کسی اسلامی روایت سے جزوی مشابہت کی بنیاد پر 'یہ بھی اسلام میں ہے' کہہ کر شامل اسلام کردیتے ہیں مگر اس قسم کے استدلال کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ قیاس کرتے وقت محض 'مماثلت' (similarities) ہی نہیں بلکہ 'عدم مماثلت' (*dis*-similarities) کا خیال رکھنا بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ (علمائے متقدمین نے اس بات پر نہایت زور دیا ہے اور اسی بناء پر علم الاشباہ والنظائر اسلامی علمی روایت کا ایک اہم جزو رہا ہے اور موجودہ دور میں تو اس کے احیاء کی سخت ضرورت ہے)۔ چنانچہ یہ کہتے وقت کہ 'یہ بھی اسلام میں ہے' اس پر بھی نظر رہنا چاہیے کہ 'اسلام میں کیا نہیں ہے'۔

- ہمارے تجزیے کے مطابق شرکت ومضاربت کی بنیاد پر بینکاری ممکن ہی نہیں جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون میں واضح کرنے کی کوشش کی اور مفتی صاحب نے بھی اس پر کوئی بنیادی اعتراض وارد نہیں کیا، سوائے اس کے کہ مجوزین اسلامی بینکاری علمائے کرام اسے درست اور ممکن سمجھتے ہیں (اور جو اشکالات اٹھائے ہیں، ان کی حقیقت ان شاء اللہ اگلے تبصرے میں واضح کی جائے گی)۔ لہٰذا جن معاہدات وطرق تمویل (شرکت ومضاربت) کو حضرات مجوزین بھی 'آئیڈیل' سمجھتے ہیں، وہ کم ازکم اسلامی بینکاری کے نام پر کیے جانے والے کاروبار کے تحت ناممکن ہیں۔

- رہے 'حیلہ طرق تمویل' تو ان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ناقدین علمائے کرام بلکہ خود مجوزین کو بھی قبول ہے کہ یہ عبوری دور سے متعلق ہیں اور جن کا مستقل اور منظم استعمال بعض کے نزدیک ناپسندیدہ اور بعض کے ہاں ممنوع ہے (جیسا کہ آگے آرہا ہے)۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر راقم الحروف اسلامی بینکاری وفائنانس میں اختیار کیے جانے والے معاہدات کو غلط سمجھتا ہے تو کیا اسے 'مقاصد کی آڑ میں شرع کو معطل کرنا' کہا جاسکتا ہے؟

اس وضاحت کے بعد 'کل' کو نظر انداز کر کے جزو پر فتوے دینے کی غلطی سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کرتے ہیں۔ ایک ایسے غلیظ معاشرے کا تصور کیجیے جہاں فحاشی و بدکاری اس طرح عام ہو جائیں کہ اسے با قاعدہ طور پر ایک منظّم معاشرتی صف بندی کی حیثیت حاصل ہو جائے، لوگوں کا احساس گناہ اس حد تک گر جائے کہ وہ نکاح کے بجائے زنا کو ترجیح دینے لگیں، نیز ریاستی قوانین بھی نکاح کو مشکل اور زنا کو آسان بنائیں (جیسا کہ دنیا کے کئی ممالک کا یہ حال ہے)۔ ایسے ماحول میں ایک 'تہجد گزار فرد' بھی خود کو ایسے حالات میں پائے گا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی اولاد ہی کو بلکہ خود کو بھی زنا و بدکاری کی آلائشوں سے بمشکل ہی بچا پائے گا جس کا اظہار یہ اعداد وشمار ہیں کہ مغربی معاشروں میں محض پندرہ سال کی عمر تک پہنچنے والے بچوں میں سے ستر فیصد سے زائد بچے کم از کم ایک مرتبہ زنا کا ارتکاب کر لیتے ہیں، کئی ممالک میں پچاس فیصد سے زائد بچے حرامی النسل ہوتے ہیں۔ فرض کریں اس ماحول میں کوئی 'خدا ترس' عالم' تہجد گزار' مسلمانوں کو' بدکاری کے گناہ سے بچانے' کے لیے' عموم بلوی' اور' وقت کی ضرورت' کو دلیل بنا کر' اسلامی قحبہ خانے' بنائے جہاں بڑی تعداد میں بدکاری کے شعبے سے متعلق عورتوں کو جمع کر لے اور پھر درج ذیل' شرعی' اصولوں کی پابندی کرنا شروع کر دے:

- وہاں' بلاضرورت شرعیہ' مرد وزن کا اختلاط نہ ہونے دے۔
- مباشرت سے قبل' نکاح' کی رسم اور' مہر' کی رقم طے کروائے۔
- نکاح کروانے کے لیے' شرعی قاضیوں' اور' گواہوں' کا انتظام موجود ہو۔
- مباشرت کے بعد شوہر بیوی کو' طلاق' دے کر' مہر کی رقم ادا' کر دے۔
- کیونکہ عورت کے لیے ہر طلاق کے بعد نئے نکاح کی راہ میں' عدت' کی طویل مدت حائل ہوگی، لہٰذا یہاں غامدی صاحب کے فتوے پر عمل کرلے کہ اگر میڈیکل ٹیسٹ سے ثابت ہو جائے کہ حمل نہیں ٹھہرا تو عدت ختم ہو جائے گی، لہٰذا اسلامی قحبہ خانے میں اعلیٰ قسم کی لیبارٹری بھی بنوالے۔

ذرا غور تو کیجیے کہ' اسلامی قحبہ خانے' بنانے میں کس قدر شرعی مسائل کا لحاظ کیا جا رہا ہے۔ قریہ قریہ' اسلامی قحبہ خانے' بنانے کے بعد یہ نقشہ وہ آپ کے سامنے پیش کر کے پوچھے کہ بتائیے، اس میں کیا خرابی ہے اور آپ بجائے اسے ایک' کل' کے' اس میں جو اچھا ہے، وہ لے لو اور جو برا ہے اسے چھوڑ دو' کی بنیاد پر جزواً جزواً پرکھ کر یہ کہنے لگیں کہ' میاں یہاں عدت گزارنے کا طریقہ فقہ حنفی کے مطابق نہیں ہے' یا' گواہ صفت عدالت سے متصف نہیں' وغیرہ تو ایسے طریقہ اجتہاد کو کیا کہا جائے گا؟ کیا (کسی دوسری فقہ کی روشنی میں کوئی فقہی حل تجویز فرما دینے کے بعد) عدت گزارنے کے طریقے کو درست کر لینے سے واقعی یہ' اسلامی قحبہ خانے' کہلانے کے مستحق ٹھہریں گے اور ہم خلق خدا کو' غیر اسلامی کوٹھوں' کے بجائے' اسلامی قحبہ خانے' جانے کی ترغیب دلانے کے لیے اشتہاری مہمیں شروع کرنے پر زور دینے لگیں گے اور خود ان قحبہ خانوں میں کنسلٹنٹ بھرتی ہونے کی فکر کرنے لگیں گے کہ دیکھیں کہیں یہ' غیر شرعی' اصولوں پر نہ چل نکلیں؟ ہوسکتا ہے کسی کو' اسلامی قحبہ خانے' کی یہ مثال محض ایک ذہنی عیاشی لگتی ہو، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مصر کے فقیہ العصر علامہ یوسف قرضاوی صاحب نے نکاح المسیار کی اجازت دے کر اسلامی قحبہ خانے بنانے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اب ضرورت ہے تو بس ہمت کی۔ یقین مانیے جس معاشرتی ماحول کی اوپر منظر کشی کی گئی، وہاں ایسی کاوشوں کے حامی چند علماء کرام کا دستیاب ہو جانا نیز عوام الناس میں ان کا مقبول ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی۔ اگر بات صرف جزو ہی کی ہے تو پھر' اسلامی قحبہ خانے' کے مالک کا کیا

قصور ہے کہ اس کا یہ ’شرعی جواز‘ نہ مانا جائے کہ اسلام نے شہوانی جذبے کا جائز طریقے سے اظہار حرام کب قرار دیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو اسلام مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہی کیوں دیتا؟ نیز اسلامی بینکاروں کے فلسفے کو بنیاد بنا کر وہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ ’جناب اسلام میں جائز اور ناجائز کا فرق صرف طریقہ کار کی تبدیلی پر مبنی ہے، اگر جانور بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے ورنہ حرام، اسی طرح میں نے غیر اسلامی کوٹھوں کو غیر شرعی طریقوں سے پاک کر کے اصول شرعیہ (Shariah compliance) کی روشنی میں انہیں اسلامی قحبہ خانوں میں تبدیل کر دیا ہے، ٹھیک ہے اس کوشش میں ابھی تک مجھے سو فیصد کامیابی نہیں ملی، لیکن ناقدین کو چاہیے کہ میری کاوشوں کو ’کل‘ کی روشنی میں جانچ کر رد کرنے کے بجائے اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمائیں تاکہ اس کار خیر میں مزید بہتری لائی جا سکے۔

اس سلسلے میں مثالوں کا ایک دفتر پیش کیا جا سکتا ہے، مگر خوف طوالت کی بنا اسی ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ سمجھنے کے لیے اس میں بہت سا مواد موجود ہے۔ مسند امام احمد (۱۸۴) میں سالم بن عبداللہ کی روایت کا مفہوم ہے کہ غیلان بن سلمہ نے حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں جب اپنی بیویوں کو طلاق دے کر اپنا مال بھائیوں میں تقسیم کر دیا تو حضرت عمرؓ نے اسے بلا کر کہا کہ تمہیں اپنی بیویوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور تقسیم شدہ دولت واپس لینا ہوگی، بصورت دیگر میں (اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے) تمہاری بیویوں کو تمہارا وارث بناؤں گا۔ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خوبصورت مگر بانجھ عورت سے نکاح کی تین مرتبہ اجازت طلب کی، آپ نے تینوں مرتبہ منع فرما دیا (ابن حبان ۳۹۸۸، ابوداؤد ۲۰۵۳، نسائی ۳۲۲۹) حالانکہ بانجھ عورت سے نکاح حرام نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ مقاصد شریعہ کی کلیت کو متاثر کرتا ہے، لہٰذا اجازت نہ دی گئی۔ درج بالا مثال کی طرح ان چند روایات ہی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ یہ موضوع بذات خود ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے (۵)۔ اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کے لیے اس وقت تک کوئی مثبت اسلامی حکمت عملی تیار نہیں کی جا سکتی جب تک تجزیے کا نقطہ ماسکہ جزوی تفصیلات نہیں بلکہ ’نظام‘ نہ بن جائے۔

اس مقام پر یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ’مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری‘ کے مصداق خود مجوزین کے گھر سے ’کل‘ کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے حق میں ثبوت پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب ’مقاصد شریعت‘ کا باب نمبر ۶ (مقاصد شریعت کی روشنی میں معاصر مالیات کا جائزہ) چشم کشا حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجوزین کے ہاں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ’استاذ الاساتذہ‘ کی سی ہے (کیونکہ خود مولانا تقی عثمانی بھی اسلامی معاشیات میں انہیں اپنا استاد مانتے رہے ہیں)۔ چونکہ ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ درج بالا اصول خود مجوزین کے نزدیک بھی معتبر ہے، لہٰذا ہم یہاں چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، تفصیلات کے لیے کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

- چنانچہ ڈاکٹر صاحب ایک بیع کے اندر ایک سے زائد معاہدات کو جمع کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں: ’’یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا ہوگا کہ عام حالات میں، یا الگ الگ کیے جانے کی صورت میں، جو معاملات درست ہوں، وہ بھی اس صورت میں قابل قبول نہیں رہ جاتے جب ان کے نتیجے میں عدل وانصاف کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، ظلم اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور مقاصد شریعت صراحۃً مجروح ہو رہے ہوں‘‘۔ (ص: ۲۰۷)

- مجوزین اسلامی بینکاری کے طریقہ تحقیق کے بارے میں فرماتے ہیں: ’’یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا مرکز توجہ اسلامی مالیاتی اداروں کے روزمرہ مسائل رہے، یہ ان کلی امور پر توجہ نہیں مرکوز کر سکے جو اسلامی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام سے

اور ان دونوں نظاموں کے مالیاتی اداروں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں‘‘۔ (ص: ۲۱۶)۔۔۔’’معاملات کے باب میں خاص طور پر فقہ اسلامی کے ائمہ مثلاً ابوحنیفہؒ اور مالک بن انسؒ کسی طریقہ پر صاد کرنے سے پہلے عواقب اور مال کار پر ضرور نظر ڈالتے تھے۔ ان کا فیصلہ مصالح عامہ کو سامنے رکھ کر ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کے استحسان اور امام مالکؒ کے مصالح مرسلہ کی یہی نوعیت تھی۔ صرف متعلقہ عقود کی سلامتی کسی ایسے طریقہ پر صاد کرنے کے لیے کافی نہیں جس کے مفسدہ کا پلہ اس کی کسی منفعت پر بھاری ہو‘‘ (ص: ۲۱۷)

- مجوزین کے زاویہ نگاہ نے امت مسلمہ کو کیا دیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ’’گزشتہ تیس برسوں میں جزئی نظر اور روزمرہ مسائل کے حل پر مرکوز فتاوی نے آج اسلامک بینکنگ اور فنانس کو ایسی شکل دے دی ہے جو مال کار اور اپنے عواقب کے اعتبار سے ہمیں وہیں پہنچا رہی ہے جہاں سودی قرضوں پر مبنی بینکنگ اور فنانس نے پوری انسانیت کو پہنچا رکھا ہے‘‘۔ (۲۱۷)

- پھر قرض کی مثال دے کر جزوی اور کلی دونوں نقطہ نگاہ سے معاملے کا موازنہ کرنے کی اہمیت اجاگر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ’’یہ موازنہ نہ دینی مدارس میں نہیں سکھایا جاتا، نہ ہی متعلقہ علوم دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہیں‘‘۔ (۲۱۷)

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ سب زاہد مغل تحریر کر رہا ہے، بلکہ مجوزین کے استاذ الاساتذہ فرما رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب بذات خود سرمایہ دارانہ نظام کے جزوی ناقد ہیں، مگر یہاں اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس حد تک اسلامی بینکاری کو مقاصد شریعت کے خلاف سمجھتے ہیں، اس قدر اسے غلط قرار دے رہے ہیں، چاہے اس میں ہونے والے انفرادی معاہدات جزوی سطح پر بظاہر ٹھیک ہی کیوں نہ نظر آ رہے ہوں۔ ہمیں امید ہے کہ جب مجوزین موجودہ نظام کا مزید بہتر ادراک حاصل کر لیں گے تو ان شاء اللہ انہیں اپنی باقی ماندہ غلطی کا احساس بھی ہو جائے گا۔

☆ **نئی فکر ناقابل التفات نہیں ہوتی:** مفتی صاحب نے صد فیصد درست فرمایا کہ جو گزارشات ہم پیش کر رہے ہیں وہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں جن کا نقد و نظر کی چھلنی سے گزرنا ابھی باقی ہے، ایسی ابتدائی فکر کی بنیاد پر کسی چلتے ہوئے نظام کو ترک کر کے انارکی کی حالت اختیار نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں اس انداز فکر پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہم نے یہ کب کہا کہ سب لوگ دل و دماغ بند کر کے ہماری فکر کے پیچھے چل پڑیں۔ اس کے برعکس یہ گزارشات پیش ہی اس لیے کی گئی ہیں کہ ’کھلے ذہنوں‘ کے ساتھ ان پر غور و فکر کیا جائے کہ اگر بیماری کی تشخیص اور اس کا علاج تجویز کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے تو اس کی اصلاح ہو جائے۔ ’اب تک چھلنی سے نہ گزرنے‘ کا یہ مطلب بھی نہیں نکلتا کہ چھلنی کا منہ بند کر کے کسی دوسری شے کو اس میں سے گزرنے ہی نہ دیا جائے یا اسے ناقابل التفات قرار دے دیا جائے۔ یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ ایک فکر کو آپ ’کس فکری چھلنی‘ سے گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ کسی فکری چھلنی کا منہ کس قدر کھلتا ہے، اس کا تعلق براہ راست اس فکر کے حاملین کے فکری پس منظر سے ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کتنی تبدیلی درکار ہے۔ نئی فکر اگر کسی ایسی تبدیلی کا تقاضا کرے جس کی موجودہ فکری چھلنی متحمل ہی نہ ہو تو ایسی صورت میں چھلنی بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجوزین اسلامی بینکاری کے جس فکری پیمانے کے ذریعے ’نئی فکر‘ کو جانچنے کی کوشش کی جا رہی ہے، بذات خود اس پیمانے کو بھی تو جانچنے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ محض اس بنیاد پر کہ وہ پیمانہ حاضر و موجود ہے یا چند نامور شخصیات نے انہیں تھام رکھا ہے، اس کے ٹھیک ہونے کی کوئی دلیل تو نہیں۔

پھر جہاں کسی نئی فکر کو تنقید کی چھلنی سے گزارنے کی بات کرنا ایک اہم علمی نکتہ ہے، وہیں ان اہل علم کو یہ اصول بھی یاد رکھنا چاہیے کہ باطل کی نفی اثبات حق پر نہ صرف مقدم ہے بلکہ اس کی پیشگی شرط بھی ہے (۶)۔ کسی شے کے متبادل کی فراہمی میں یہ چیز فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے کہ معاشرے میں اس متبادل کی طلب کتنی شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے اور شدت طلب کا انحصار اس بات پر ہے کہ لوگ کس قدر حاضر و موجود نظام سے نالاں ہیں اور اس سے براءت چاہتے ہیں۔ متبادل کی نوبت تبھی تو آئے گی جب معاشرے کا ایک موثر طبقہ 'موجود' سے بیزار ہوگا۔ اگر آپ کسی کو معاشرے کے ایک طبقے کو موجود سے بیزار ہی نہ کرنے دیں گے اور متبادل نہ ہونے اور 'نئی فکر' ہونے کے باعث چپ کراتے رہیں گے تو متبادل کی نوبت کیونکر آئے گی؟ چنانچہ جس شے کی عدم موجودگی کو دلیل بنا کر مجوزین اپنے ناقدین کو خاموش کرانے کی کوشش کرتے ہیں اس کا پایا جانا تو منحصر ہی اس بات پر ہے کہ معاشرے پر اثر انداز ہونے والے طبقے میں اس کے طلبگار پیدا ہو جائیں کیونکہ وہ بغیر طلب کے فراہم ہو جانے والی شے نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی چیز کی معاشرے میں بالکلیہ طلب نہ ہو، مگر اس کی پیداوار کے ڈھیر لگ جائیں۔ اس کی پیداوار کے لیے جس قدر محنت کی ضرورت ہے، وہ اسی وقت فراہم ہو پائے گی جب معاشرہ اسے اپنی ناگزیر ضرورت سمجھے گا۔ یہ عجیب منطق ہے کہ غلط کو غلط مت کہو، اسے قائم و دائم رہنے دو اور اس کے خاتمے کا سوال بھی مت اٹھاؤ کیونکہ اسے غلط کہنے کے لیے جو چیز پاس ہونی چاہیے، اسلامی بینکاری کے ناقدین اپنے پاس نہیں رکھتے۔ پس یاد رکھنا چاہیے کہ متبادل سے بات 'شروع' نہیں ہوگی بلکہ اس پر بات 'ختم' ہوگی۔ ظاہری بات ہے جب تک کسی چلتے ہوئے نظام کے خلاف کوئی دعوت اٹھے گی ہی نہیں تو وہ تبدیل کیسے ہوگا؟

پھر کیا ہی اچھا ہو اگر یہی مشورہ اسلامی بینک قائم کرنے والے ماہرین اسلامی فائنانس اور علمائے کرام کو بھی دیا جائے کہ ان حضرات کو بھی اپنی فکر و حکمت عملی کو ہر قسم کی تنقید کی چھلنی سے گزارنے کے بعد ہی اسلامی بینک قائم کرنا چاہیے تھے، کیونکہ اپنے اس عمل کی وجہ سے انہوں نے امت کو شدید فکری الجھاؤ سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے کہ یہ حضرات تو اس اصول سے مستثنیٰ ہو کر آئے دن اپنی خام فکر کی بنیاد پر (نام نہاد) اسلامی بینکنگ کے کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف عمل رہیں، قریہ قریہ جا کر اپنی برانچیں کھولتے رہیں، اس کے نام پر دنیا بھر میں کھربوں ڈالر کا کاروبار چمکائیں مگر جب ناقدین کچھ کہنے کی جسارت کریں تو ان کے پلے یہ سنہرا اصول باندھ دیا جائے کہ 'جناب ابھی آپ کی فکر خام ہے، جب پختہ ہوگی تب اس پر کان دھریں گے'۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کے متعلق کوئی صریح حکم نہ ہو تو میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس سلسلے میں عبادت گزار فقہا سے مشورہ کرنا اور کوئی انفرادی رائے قائم کرنے سے احتراز کرنا۔ (مجمع الزوائد ۱/۱۷۸)۔ اس حدیث کے مطابق کیا عمائدین اسلامی بینکاری پر لازم نہ تھا کہ اپنی انفرادی رائے کی بنا پر امت کو اسلامی بینکاری کے خطرات میں مبتلا کرنے سے پہلے کم از کم دیوبندی حلقہ علماء ہی میں کوئی اجتماعی رائے قائم کرنے کا اہتمام فرماتے۔

☆ **اکابرین کے غیر متعلقہ اقوال کا حوالہ:** مفتی صاحب نے یہ شکوہ (بلکہ بعض مقامات پر خبردار) بھی کیا ہے کہ درحقیقت اپنے مضمون کے ذریعے پس پردہ ہم نے یک لخطہ ان تمام اکابر علمائے کرام کی تردید وتحقیر کر دی ہے جو اسلامی بینکاری کے حق میں تھے یا ہیں۔ ہم امید کر رہے تھے کہ مفتی صاحب ہمارے مضمون کے بنیادی مقدمے (کہ موجودہ بینک زر قرض کی جعلی رسید ہے نیز جز محفوظاتی بینکاری کے ہوتے ہوئے یہ دھوکہ بازی ختم کرنا ناممکن ہے اور اسلامی بینک اس جرم

میں برابر کے شریک ہیں) پر نقد فرماتے ہوئے علم معاشیات و ماہرین اسلامی معاشیات کے تجزیوں کی روشنی میں ہماری غلطی واضح کردیں گے مگر اس سلسلے میں ان کے پاس کہنے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین اسلامی معاشیات و حامیین اسلامی بینکاری علمائے کرام اسے غلط نہیں کہتے۔ اگر مفتی صاحب واقعی یہ ثابت کردیں کہ اس مسئلے پر امت مسلمہ کا اجماع ہو چکا ہے تو ہمیں اپنی غلطی ماننے میں کوئی حجاب نہ ہوگا کیونکہ ہم اجماع کو حجت شرعی مانتے ہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ حقیقت واقعہ ہے تو از راہ مہربانی عرض ہے کہ ان اکابر علمائے کرام نے بذات خود کبھی یہ نہیں لکھا کہ ہمارا نام لے کر تمہارے سامنے اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ بیان کرے تو اسے بلا چوں چراں دلیل طلب کیے بغیر ہی قبول کر لینا۔ جہاں تک جدید اسلامی تحقیقاتی اداروں اور ان میں کام کرنے محققین کی بات ہے تو ان کے بارے میں ہماری رائے یہی ہے کہ 'ھم رجال و نحن رجال '، جیسے اپنی تحقیق (صحیح یا غلط) کی بنیاد پر وہ اپنی رائے رکھنے کا حق رکھتے ہیں، اسی طرح ناقدین اسلامی بینکاری کو بھی اس کا حق ملنا چاہیے۔ ان قد آور شخصیات کے باوزن ناموں کے نیچے کسی کی آواز دبانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ مفتی صاحب ہم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ہم ان تمام حضرات کو غلط کہنے کی جسارت کرنا چاہتے ہیں، ہم بصد ادب مفتی صاحب کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ اگر وہ ان سب حضرات کے معصوم عن الخطا ہونے کی گواہی دینے کے لیے تیار ہیں تو ہم آج ہی سے اسلامی بینکاری کی مخالفت ترک کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جہاں تک اکابر علماء کرام کی بات ہے تو اس کے بارے میں ہم آگے عرض کریں گے، مگر جہاں تک دور حاضر کے علمائے کرام کا تعلق ہے تو ان کی دینی علوم پر دسترس پر راقم کو کوئی شک وشبہ نہیں اور نہ ہی ان کی تجہیل خدانخواستہ ہمارا مقصد رہا ہے، البتہ یہ تاثر بہر حال قائم ہے کہ اگر ایک طرف وہ 'مجتہد فی علوم الشرع' ہیں تو دوسری طرف 'مقلد فی علم الاقتصاد' ہیں اور درحقیقت یہی مسئلے کی اصل جڑ ہے۔

اسلامی بینکاری کے خلاف چھپنے والے علمائے کرام کے متفقہ فتوے کے جواب میں کچھ عرصہ قبل 'غیر سودی بینکاری' کے نام سے ایک کتاب چھپ کر منظر عام پر آئی جس کا پہلا باب ہی 'اسلامی متبادل' (خصوصاً بینکاری نظام کے متبادل) کے امکانات و اہمیت سے بحث کرتا ہے۔ کتاب کے نہایت محترم اور فاضل مصنف اس باب میں بینکاری نظام کے اسلامی متبادل کے امکانات ثابت کرنے کے لیے یا تو پرانی دلیلوں کو بعینہ دھرا دیا ہے (گویا ان دلیلوں کے خلاف آج تک کوئی تنقیدی بات کہی ہی نہ گئی ہو) اور یا پھر کوئی علمی دلیل قائم کرنے کے بجائے چند اکابر علمائے کرامؒ (جن کا ذکر مفتی صاحب نے بھی فرمایا) کے اقوال نقل کر کے اپنے دعوے میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے نزدیک اسلامی بینکاری کے حق میں اپنے پیش رو علمائے کرام کے اقوال پیش کرنا ہی محل نظر ہے کیونکہ انکے یہ اقوال اس دور پر محمول ہیں جب:

(۱) بینکاری نظام کی اصل حقیقت اور سرمایہ دارانہ نظام سے اس کا تعلق علمائے کرام پر مکمل طور پر واضح نہ ہو سکا تھا، لہذا علمائے کرام نے اس کے متبادل کے امکانات پر آراء کا اظہار فرمایا، مگر آج ان بنیادی مباحث کی وضاحت کے بعد ان آراء و اقوال کو اپنے حق میں استعمال کرنا درست نہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جن اکابر علمائے کرام کے اقوال محترم مصنف نے بطور دلیل پیش کیے ہیں اگر ان علمائے کرام کے سامنے یہ مباحث پیش کر دیے جاتے تو یقیناً وہ بینکاری کے اسلامی متبادل کا فتوی نہ دیتے کیونکہ ان علمائے کرام نے اسلامی بینکاری کا متبادل کسی دنیاوی منفعت، مال و متاع یا شہرت کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض رضائے الٰہی کے لیے پورے خلوص کے ساتھ حق سمجھ کر بیان کیا۔ اس مقام

پر یہ گمان نہیں کرنا چاہئے گویا اس بحث سے اکابر علماء کرام پر نامکمل تحقیق کے بغیر فتوی دینے کا الزام عائد ہوجاتا ہے، حاشا و کلا۔ درحقیقت تحقیق ایک 'عمل' کا نام ہے نہ کہ کسی 'واقع' کا جو فوراً سے وقوع پزیر ہوجاتا ہو۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ابتداً لاؤڈ سپیکر میں ادائیگی نماز کو جید علمائے کرام نے ناجائز کہا مگر جیسے جیسے تحقیق کا عمل آگے بڑھا ان جید علماء کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ سے اختلاف کرتے ہوئے اسے جائز کہا۔ ظاہر ہے نئی تحقیق کی روشنی میں نیا فتوی دینے سے نہ تو اکابرین پر کوئی الزام عائد ہوتا ہے اور نہ ہی انکا علم و فضل کم ہوتا ہے

(۲) علمائے کرام نے ابتداً حیلوں پر مبنی اسلامی بینکاری کی اجازت اس امید پر دی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ اپنی اصل بنیادوں (مشارکت و مضاربت) کی طرف بڑھتی چلی جائے گی مگر طویل عرصے پر محیط تجربے سے ثابت ہوچکا کہ اسلامی بینکاری اپنی اصل بنیادوں کی طرف بڑھنے کے بجائے حیلوں کو ہی مستقل اصول بنانے پر مصر ہوتی چلی گئی ہے (فاضل مصنف کی درج بالا مذکور کتاب اس رویے کی ایک واضح مثال ہے جس کا مقصد حیلوں کو عمومی و آفاقی اصولوں کے طور پر اپنانے کا سر توڑ جواز پیش کرنا ہے)۔ مثلاً سٹیٹ بینک آف پاکستان کی سالانہ رپورٹس کے مطابق اسلامک بینکنگ میں مختلف طرق تمویل کی شرح استعمال کچھ اسطرح ہے:

سال	مشارکہ	مضاربہ	مشارکہ متناقصہ	مرابحہ	اجارہ	سلم	استصناع	دیگر
۲۰۰۷	1.6%	0.3%	25.6%	44.5%	24%	1.4%	1%	
۲۰۰۸	1.7%	0.2%	30.5%	40.6%	20.5%	1.8%	2.9%	1.8%
۲۰۰۹	2.5%	0.6%	31.44%	40.25%	18.2%	2.01%	3.35%	1.6%

اس گوشوارے کو دیکھنے سے بالکل واضح ہے کہ اسلامی بینکوں میں اب تک نوے فیصد (90%) سے زیادہ کام اجارہ، مرابحہ اور مشارکہ متناقصہ سے چلایا جارہا ہے جبکہ مجوزین اسلامی بینکاری کے بقول اصل اسلامی طرق تمویل یعنی مشارکہ اور مضاربہ کا فیصدی حصہ تین فیصد (3%) سے بھی کم ہے (یہاں ذہن میں یہ سوال مچلتا ہے کہ اگر واقعی اسلامی بینکاری کسی مجبوری کا نام ہے تو اسلامی بینکوں کو نفع کی لالچ کے سواء آخر کس چیز نے کھربوں روپے کے حیلہ طرق تمویل کرنے پر مجبور کر رکھا ہے؟)۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ اس پورے عرصے کے دوران دنیا بھر میں اسلامی بینکاری کی مقبولیت میں اضافہ نہ ہوا ہو۔ مثلاً سٹیٹ بینک آف پاکستان ہی کے مطابق ملک بھر میں سال ۲۰۰۳ سے لیکر ۲۰۰۸ تک اسلامی بینکوں کے کاروبار کی شرح نمو درج ذیل رہی:

متعلقہ تفصیل	شرح نمو
اثاثوں (Assets) کے حجم میں اضافہ	2023%
کھاتوں (Deposits) میں اضافہ	2500%
طرق تمویل کے استعمال اور سرمایہ کاری میں اضافہ	1770%
اسلامی بینکوں کی برانچوں میں اضافہ	2930%

دیکھئے ایک طرف تو اسلامی بینکاری کے حجم میں اس قدر ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے مگر دوسری طرف یہ اپنی اصل کی طرف

بڑھنے کے بجائے محض حیلوں بہانوں کو عام کرنے کی روش بدستور برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اب ایک طرف اسلامی بینکوں کی اس 'عملی روش' کو سامنے رکھئے اور دوسری طرف ماہرین اسلامی بینکاری کے یہ 'کتابی اصول' ملاحظہ فرمایئے جن کے مطابق حیلہ طرق تمویل 'عبوری دور' سے متعلق ہیں:

چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ''اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کے شریعہ ایڈوائزری بورڈ اس نکتے پر متفق ہیں کہ یہ (مرابحہ اور اجارہ) فائنانسنگ کے مثالی طریقے نہیں ہیں اس لیے انہیں 'صرف' ضرورت کے موقع پر ہی استعمال کرنا چاہئے۔'' (اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص۱۹)

اسلامی نظریاتی کونسل اپنی تجاویز میں کہتی ہے: ''یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ طریقے بالآخر سودی لین دین اور اس سے متعلقہ برائیوں کے از سر نو رواج کے لیے چور دروازے کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ لہٰذا یہ امر ضروری ہے (کہ) ان طریقوں کا استعمال 'کم سے کم حد تک' 'صرف' ان صورتوں اور 'خاص حالات' میں کیا جائے جہاں 'یہ ناگزیر' ہوں اور اس بات کی 'ہرگز اجازت نہ دی جائے' کہ یہ طریقے سرمایہ کاری کے 'عام معمول' کی حیثیت اختیار کر لیں''۔ (رپورٹ بلاسود بینکاری: ص۱۳)

درج بالا حقائق کو نظر انداز کر کے آخر اسلامی بینکاری کے آہستہ آہستہ 'عبوری دور' سے نکل کر اپنی اصل کی طرف گامزن ہونے کی امیدوں کے سبز باغ دکھانے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ خود مجوزین کو بھی قبول ہے کہ آج کی اسلامی بینکاری اس سے یکسر مختلف ہے جس کا خواب ابتداً دیکھا گیا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب اسلامی بینکاری کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ابتداء اسلامک بینکنگ کا ماڈل مضاربت پر مبنی تھا۔۔۔ مگر جلد ہی زیادہ تر اسلامی بینکوں نے براہ راست پر خطر کاروبار سے اجتناب کرتے ہوئے ایک ایسا طریقہ اختیار کر لیا جس میں نفع تقریباً یقینی ہو اور اسکی شرح پہلے معلوم رہے، یہ بیع المرابحہ کا طریقہ تھا۔۔۔ (انہی مرکبات) کے اجراء نے اسلامک بینکنگ کو عام کرنے اور اسے عوام سے قریب تر کرنے میں بڑا حصہ لیا۔۔۔ مرابحہ، اجارہ منتہیہ بالتملیک، متوازی سلم، صکوک (جن کے بطن میں بیع الدین بھی جائز ہو گیا) اور اب حال میں تورق کے اضافے نے آج کی اسلامک بینکنگ کو اس سے بہت مختلف بنا دیا جس کا چرچا بیسویں صدی کی پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں سامنے آنے والے لٹریچر میں ملتا ہے''۔ (مقاصد شریعت، ص۲۱۲ تا ۲۱۴)

چنانچہ جن حالات، شرائط اور امیدوں کی بنیاد پر اکابر علماء کرام نے جواز اسلامی بینکاری کے اقوال فرمائے تھے، ایک طرف وہ حالات ہی اب مکمل طور پر بدل چکے ہیں اور دوسری طرف انکی شرائط بھی پوری نہ ہو سکیں، لہٰذا بدلے ہوئے حالات میں ان اقوال کو بطور دلیل پیش کرنا اصولاً درست نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حقائق واضح ہو جانے کے بعد آج اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بجائے انہیں اکابر علماء کے اقوال کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرنے کا رویہ بذات خود ان ربانی علماء کرام کی توہین کے زمرے میں شمار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر اس موقع پر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی بینکاری کے مختلف طرق تمویل فروغ پانے کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کے دو ممکنہ جوابات ہو سکتے ہیں: اولاً یہ طرق تمویل تعلیمات شرع کے مطابق ہیں، دوئم یہ طرق

تمویل سودی بینکاری نظام کی طرح باآسانی 'نفع کے نام' پر سودی معاملہ کرنے میں مددگار ہیں۔ ظاہر ہے اگر پہلا جواب درست ہوتا تو مرابحہ واجارہ کی طرح شرکت ومضاربت بھی بڑے پیمانے پر فروغ پاتے مگر دنیا میں ایسا کہیں بھی نہیں (۷)۔ چنانچہ یہ اعداد وشمار چیخ چیخ کر یہ حقیقت بیان کررہے ہیں کہ اسلامی بینکاری کی مقبولیت کی وجہ اسکی اسلامیت نہیں بلکہ عالمی سودی نظام میں ضم ہوسکنے کی صلاحیت ہے اوراسی لیے اس کے ذریعے وہی طرق تمویل فروغ حاصل کررہے ہیں جوفرضی بیع اور نفع کے نام پر قرض پر سودی معاملات کرنے میں مددگار ہیں۔ اسلامی بینکاری سے متعلق درج بالا اعداد وشمار کوئی حادثہ یا سازش نہیں بلکہ عین اسکی اصل کا اظہار ہیں کہ اسلامی معاشیات وبینکاری محض سرمایہ داری کا ایک نظریہ ہے (جیسا کہ راقم نے اپنے مضمون 'اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز' میں واضح کیا ہے)۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی بینکاری درحقیقت سودی بینکاری کا متبادل کم اور تکملہ ومددگار (complement) زیادہ ہے کہ یہ اس کے شانہ بشانہ چلنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

اس موقع پر 'مجوزین برائے فروغ حیلہ طرق تمویل' یہ عجیب وغریب استدلال پیش کرتے ہیں کہ شرکت ومضاربت کے فروغ نہ پانے کی اصل وجہ عوام میں ایمانداری کا فقدان ہے۔ اس پر سوالات یہ پیدا ہوتا ہیں کہ کیا اسلامی بینکاری بے ایمان لوگوں کو سہولت فراہم کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے؟ کیا واقعی شرعی حیلوں کا مقصد مسلمانوں کی کرپٹ آبادی کے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے؟ کیا ان کرپٹ منافقین کی خدمت کے لیے دین کا حلیہ بگاڑنا جائز ہے؟ ہمیں تو کہیں سے یہ خبر پہنچی تھی کہ اسلامی بینکاری علمائے کرام کے 'تہجد گزار' حلقہ احباب اور 'متقی' مریدین کے پرزور اصرار پر ان کی ناگزیر شرعی ضروریات پوری کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ اسلامی بینکاری بطور حکمت عملی کی اصل غلطی سمجھنا ہوتو اس کا تقابل دینی تعلیم کے فروغ کے لیے نجی سطح پر علمائے کرام کے قائم کردہ مدارس کے نظام سے کرلینا چاہئے جہاں موجودہ تعلیمی نظام کا کوئی ادنی شائبہ بھی نہ پڑنے دیا گیا۔ ذرا سوچئے کہ اس دینی نظام تعلیم کو نفع خوری سے کیوں محفوظ رکھا گیا؟ آخر اس کی مسند وتعلم کے دروازے حیلوں کی آڑ میں ہر شخص کے لیے کیوں نہ چوپٹ کھول دیے گئے؟ آخر یہاں موجودہ علوم سے کیوں اعتنا برتا گیا؟ علمائے کرام نے اپنی بے لوث قربانیوں کے ذریعے مدرسہ نظام تعلیم کو کس کس طرح سرمایہ دارانہ ساختوں سے محفوظ رکھا، اگر اس پر غور کرلیا جائے تو کام کرنے کا آئیڈیل ماڈل ہمارے سامنے عیاں ہوجائے گا اور اسلامی بینکاری کی غلطی سمجھانے کے لیے طویل مضامین تحریر کرنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔

☆ **حوالوں کا مسئلہ:** ضمنی طور پر ایک بات عرض کرنا ضروری محسوس ہورہا ہے۔ مفتی صاحب نے ہمارے اصل مضمون میں درج ایک حدیث کا مکمل حوالہ نہ دینے پر چند عجیب وغریب شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ حوالوں کے متعلق یہ بات مسلمہ ہے کہ اس کی تفصیلات کی نوعیت مخاطب کی علمی استعداد نیز زیر بحث موضوع کی نوعیت (کہ وہ مخاطبین کے لیے کس قدر معلوم یا اجنبی ہے) کے مطابق ہوتی ہے۔ چونکہ راقم کے مخاطبین مجوزین اسلامی بینکاری علماء کرام تھے، لہٰذا ان کے بارے میں ہمارا یہ مفروضہ تھا کہ انہیں علوم اسلامی کی زیادہ تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس معاملے میں وہ راقم سے کئی گنا زیادہ علم رکھتے ہیں، البتہ معاشیات وغیرہ کی کتب کے ذرا تفصیلی حوالے پیش کردیے گئے کیونکہ یہ ان کی سرگرمی کے اصل میدان نہیں اور نہ ہی ان کتب کی انہیں براہ راست واقفیت ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب **تھافت الفلاسفہ** میں درجنوں یونانی افکار کا رد کیا مگر کوئی حوالہ نہ دیا کہ فلسفیوں کا فلاں نظریہ میں نے فلاں کتاب سے لیا ہے۔ اس

کی وجہ یہ نہیں کہ امام صاحب حوالوں سے بے خبر تھے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ جن مباحث پر آپ گفتگو فرما رہے تھے، وہ علماء کے لیے اجنبی مباحث نہ تھے کیونکہ اس دور کا تقریباً ہر عالم ان سے واقف تھا۔ مفتی صاحب ہم سے حدیثوں کے مکمل حوالے مانگ رہے ہیں، جب کہ ہمیں تو اس بات کا شکوہ ہے کہ آج ہمارے مدارس کے طلباء مغربی علمیت کی مبادیات تک سے اس قدر ناواقف کیوں ہیں کہ انہیں ان کے بارے میں بھی کتابوں کے حوالے دینے کی ضرورت پڑتی ہے، آخر ہمارے طلبا و علما امام غزالیؒ کے دور کے علما کی طرح جدید فلسفیانہ مباحث سے مانوس کیوں نہیں؟ چنانچہ حوالوں سے متعلق یہ اصول اس قدر مسلم ہے کہ خود مفتی صاحب کے زیر تبصرہ مضمون سے بھی اس کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہے۔ مثلاً موجودہ نظام زر کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ مفتی صاحب فرماتے ہیں:

''موجودہ نظام زر میں کیا کیا خامیاں ہیں، اس سلسلے میں مسلمان معاشی مفکرین اور مسلمان فقہا کی ایک جماعت یہ رائے رکھتی ہے کہ ہمیں طلائی معیار کی طرف دوبارہ لوٹنا پڑے گا (جدید معاشی مفکرین میں سے نمساوی مکتبِ فکر Austrian school of economists کا نقطۂ نظر بھی اس سے ملتا جلتا ہے)''

دیکھیے اس اقتباس میں مفتی صاحب نے علم معاشیات کے ایک مکتب فکر کے نظریے کے بارے میں سرے سے کوئی حوالہ دیے بغیر ہی ایک دعویٰ کر ڈالا ہے۔ (سر دست عرض ہے کہ مفتی صاحب کے اس اقتباس میں Austrian school of economists کے بارے میں 'جدید' معاشی مفکرین کی اصطلاح کم از کم معیشت دانوں کے لیے ناقابل فہم ہوگی، کیونکہ اس مکتب فکر کا آغاز اٹھارہ سوستر (۱۸۷۰) کی دہائی میں Carl Menger سے ہوتا ہے، بہر حال قدیم و جدید اضافی اصطلاحات ہیں۔ ہوسکتا ہے، مفتی صاحب نے انہیں اپنے وضع کردہ کسی معنی میں استعمال کیا ہو کیونکہ علم معاشیات کی تاریخ میں تو اس مکتب فکر کو اتنا ہی پرانا سمجھا جاتا ہے جتنا neoclassical economics کو)، بندہ ناچیز اس کے تحت وہ سب کچھ نہیں دہرائے گا جو مفتی صاحب نے ہمارے مکمل حوالہ نہ دینے پر تحریر کیا ہے کیونکہ ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ مفتی صاحب کا براہ راست مخاطب راقم الحروف ہے جو علم معاشیات کا طالب علم ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا جائز ہے کہ کم از کم وہ معاشیات کے چیدہ چیدہ مکاتب فکر کے اہم نظریات سے واقف ہوگا۔ لیکن اگر پھر بھی مفتی صاحب کی خواہش ہے کہ انہیں مکمل حوالے ہی چاہئیں تو ان شاء اللہ آئندہ اس کا اہتمام کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔

☆ **ایک گزارش:** آخر میں مجوزین اسلامی بینکاری علمائے کرام کی خدمت میں دردمندانہ گزارش ہے کہ ایسی حکمت عملی سے اغماز کریں جس کے نتیجے میں موجودہ نظام کے اندر اسلام اور علمائے کرام کے مفادات (stakes) بڑھتے چلے جائیں کیونکہ کسی نظام میں جس قدر آپ کے مفادات بڑھ جاتے ہیں اسے چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہوتا چلا جاتا ہے، اسی قدر آپ اس کے جواز اور اس میں شمولیت پر اصرار کرنے لگتے ہیں، اسی قدر آپ سمجھوتوں پر مبنی حکمت عملی اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ (جمہوری بنیادوں پر جدوجہد کرنے والی اسلامی تحریکات کی مجبوریوں پر غور کر لینے سے یہ سب بخوبی عیاں ہو جاتا ہے)۔ استعمار کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح موجودہ ریاستی ادارتی صف بندی کے اندر علمائے کرام کے مفادات بڑھا کر انہیں اس میں شامل کر لیا جائے تاکہ اسے تبدیل کرنے کی بات کرنے والا کوئی منفرد گروہ باقی ہی نہ رہے (ظاہر ہے علمائے کرام کے علاوہ دوسرے کسی گروہ سے اس کی امید کرنا ہی عبث ہے)۔ علمائے کرام موجودہ تعلیمی نظام کی اسلام کاری سے اس لیے بے نیاز ہیں کیونکہ اسلامی علوم کے تحفظ اور فروغ کا کوئی مفاد اس نظام تعلیم سے وابستہ نہیں، یہ کل ختم ہونے

کے بجائے آج ختم ہوانہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس میں کچھ شک نہیں کہ جو علماء کرام اسلامی بینکاری سے منسلک ہیں، وہ پورے خلوص نیت کے ساتھ اسے خدمت اسلام سمجھتے ہیں۔خدارا راقم الحروف جیسے دیگر ناقدین اسلامی بینکاری کی نیتوں پر شک کر کے انہیں علماء کرام کا مخالف (یا زبردستی گروہ متجددین کا ہم نوا) نہ سمجھا جائے۔ہمارا مقصد تو صرف انہیں نظام کفر کی حقیقت اوراس میں شمولیت کے خطرات سے آگاہ کرنا ہے۔کسی کی تجہیل یا تحقیر کرنا ہمارے مقاصد میں شامل نہیں۔

حواشی

۴۔ اسلامی بینکاری کا فکری تناظر سمجھنے کے لیے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون 'اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز' (ماہنامہ الشریعہ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۸)۔اس مضمون میں ان کتب کے حوالے بھی دے دیے گئے جن کی مدد سے ماہرین اسلامی بینکاری کے اصل مقاصد جانے جاسکتے ہیں

۵۔ محض توجہ دلانے کے لیے عرض ہے کہ مفتی صاحب کتب اصول فقہ میں 'عوارض تقلید (سماویہ)' میں 'مریض' کے مباحث سے بخوبی واقف ہوں گے۔علامہ شاطبیؒ نے بھی مقاصد شریعت اور حیلوں کی ممانعت کے تحت بہت سے قیمتی اصول بیان فرمائے ہیں۔پھر اگر یہ دیکھنا ہو کہ جدید مظاہر کو اسلامیانے میں کیسی فاش غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں تو ماہنامہ ساحل (کراچی) کے شماروں کا مطالعہ کرلیا جائے،اس نوع کی بے شمار مثالیں وہاں مل جائیں گی۔

۶۔ مضمون کا یہ نکتہ جناب حامد محمود صاحب کے مضمون 'جمہوریت' سے اخذ کیا گیا ہے۔(سہ ماہی 'ایقاظ' اکتوبر ۲۰۰۳)

۷۔ ایسا نہیں ہے کہ مختلف طرق تمویل میں حیلہ تمویل کے غالب استعمال کا رجحان شاید صرف پاکستان کے ساتھ خاص ہو بلکہ دنیا میں ہر جگہ اسلامی بینکاری کا یہی طریقہ کار ہے۔مثلاً احمد حسین صاحب کی تحقیق کے مطابق اسلامی بینکاری کے ایک بڑے چمپئین ملک ملائشیا کے ایک بڑے اسلامی بینک کی ۱۹۹۹ میں طرق تمویل کے استعمال کی شرح کچھ اس طرح ہے:

مرابحہ	اجارہ	مضاربہ	مشارکہ	قرض حسنہ
91.55%	3.41%	0.47%	0.52%	2.63%

Hussain Ahmad (2000), "Debt Financing", A Seminar paper on Islamic Banking and Finance, organized by the BIMB Institute of Research and Training Sdn Bhd

کچھ ایسی ہی کہانی سعودی عرب کے سب سے بڑے اسلامک بینک 'الراجح بینکنگ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن' کی سالانہ رپورٹس میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو بینک کی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

ڈاکٹر محمد عمر فاروق

قادیانی مسئلہ۔حقائق کیا ہیں؟

حالیہ دنوں میں لاہور میں قادیانی معبدوں پر حملوں کا سب سے زیادہ فائدہ خود قادیانی عناصر نے ہی اٹھایا ہے، کیونکہ ان حملوں سے پہلے قادیانیوں کو پاکستان میں دہشت گردانہ کارروائیوں کا مرتکب گردانا جاتا رہا ہے۔ اسرائیل میں قادیانی مشن کی موجودگی کے پیش نظر پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو قادیانیوں سے لاحق شدید خطرات میڈیا میں زیر بحث رہے ہیں۔ اسی طرح قانون توہین رسالت کو ختم کرانے کے لیے بیرونی طاقتوں کے ذریعے پاکستان پر دباؤ بڑھانے جیسے قادیانی ہتھکنڈوں کا تذکرہ ابھی محفلوں میں جاری ہی تھا کہ اُن کے معبدوں پر حملوں سے ملکی منظر نامہ میں ایک بڑی تبدیلی نے کروٹ لی۔ وہ یہ کہ سیکولر، لبرل اور لادین قلم کار کہ جن کے قادیانی لابی سے دیرینہ خفیہ تعلقات قائم ہیں، اب انہیں خوب کھُل کھلنے کا موقع ہاتھ میں آیا ہے۔ رواداری اور مظلومیت کے پردے میں وہ دھڑلے سے اپنے اخباری مضامین اور کالموں میں قادیانیوں کی حمایت میں الم غلم لکھے جا رہے ہیں اور اس طرح وہ آئینِ پاکستان کا مذاق اڑاتے ہوئے مسلمانوں کو بلا کسی دلیل کے ظالم اور قادیانیوں کو (مجرم ہوتے ہوئے بھی) مظلوم قرار دیتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لکھاری حضرات بھی ہیں جو بے خبری میں مذکورہ ٹولے سے متاثر ہو کر تحفظ ختم نبوت کی عظیم الشان ایک سو سالہ مقدس دینی جدوجہد ہی کو قابل اعتراض سمجھنے لگے ہیں۔ یہ صورتحال قادیانیوں کے حق میں نہایت سودمند اور ماضی سے بے خبر اور حال سے برگشتہ ہماری نوجوان نسل کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

۲ جون ۲۰۱۰ء کے روزنامہ ''اوصاف''، اسلام آباد میں جناب خورشید ندیم نے ''قادیانی مسئلہ'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے مجلسِ احرارِ اسلام کی قادیانیت کے حوالے سے کی گئی جدوجہد پر یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ: ''ہمارے ہاں بدقسمتی سے قادیانیت اور قادیانیوں میں فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ میرے نزدیک اس کی ایک وجہ مجلسِ احرارِ اسلام ہے۔ یہ [مجلسِ احرار] قادیانیوں کے خلاف اٹھنے والی پہلی عوامی تحریک ہے۔ اس کی قیادت خطیبوں کے ہاتھوں میں تھی اور خطیب کا مخاطب لوگوں کے جذبات ہوتے ہیں، ذہن اور فکر نہیں۔ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ عوام سے دادِ تحسین وصول کرے۔'' اگر فاضل مضمون نگار مجلس احرار اسلام کی تحریک ختم نبوت کی خدمات کے متعلق تاریخی حقائق پر نظر رکھتے تو یقیناً اُن کے قلم سے مندرجہ بالا الفاظ نہ نکلتے۔ مجلسِ احرارِ اسلام اَسّی سال سے قادیانیت کے خلاف سرگرمِ عمل ہے۔ اگر یہ جذباتی تحریک ہوتی تو یہ ابتدائی چند سالوں میں ہی دم توڑ دیتی اور گمنامی کے غاروں میں گم ہو جاتی، مگر مجلسِ احرارِ اسلام کے اکابر کی

دُوررس نگاہوں اور اُن کی خداد بصیرت نے تحفظِ ختم نبوت کے مقدس کام کی بنیاد جن اصول و عقائد اور دستور و منشور کی روشنی میں رکھی تھی، اُن کے اثرات ماضی کی نسبت آج دنیا کے ہر خطے میں زیادہ واضح انداز میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کی شبانہ روز محنت کے صلہ میں اس محاذ پر مسلمان ہر جگہ سرخرو اور منکرینِ ختمِ نبوت دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ مجلسِ احرارِ اسلام ۱۹۲۹ء میں معرضِ وجود میں آئی جس کے قیام میں محدثِ کبیر علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ جیسی نابغہ روزگار شخصیت کا اصولی مشورہ شامل تھا۔ قادیان کا قصبہ اُن دنوں قادیانیوں کی خودساختہ ریاست کا درجہ رکھتا تھا۔ جہاں پر صرف قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کا حکم چلتا تھا۔ ایسے حالات میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے شاگردوں مثلاً مولانا مفتی شفیع مرحوم وغیرہ کو وقتاً فوقتاً قادیان بھیجا کرتے تھے۔ تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو قادیانیوں کے گمراہ کن عقائد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ ہی نے قادیانیت کے خلاف مضبوط بنیادوں پر جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے اجتماع میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو پنجاب کا امیر شریعت نامزد فرمایا اور خود سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بیعت کی۔ اُن کے بعد مولانا ظفر علی خانؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ سمیت پانچ سو علماءِ کرام نے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی بیعت کر کے انہیں امیر شریعت تسلیم کر لیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اس مقدس مشن کی تکمیل کے لیے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مشورہ پر ہی آل انڈیا مجلسِ احرارِ اسلام کے نام سے ایک مستقل دینی و سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی تھی۔

مجلسِ احرارِ اسلام ہندوستان کی پہلی جماعت تھی جس نے اپنے تاسیسی اجلاس میں ہی قادیانیت کی سرکوبی کے لیے قرارداد منظور کی۔ یہ درست ہے کہ مجلسِ احرارِ اسلام کے رہنماؤں نے اپنی جرأت و بے باکی اور غیرتِ دینی کے بل بوتے پر فرنگی سامراج کو جس واشگاف انداز میں للکارا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اُن کے اِسی جرأت مندانہ اندازِ خطابت کی بدولت برِصغیر فنِ خطابت کے ایک جدید اسلوب سے متعارف ہوا، لیکن مجلسِ احرار میں صرف خطابت کے ہی شہسوار نہیں تھے، بلکہ اِس میں علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر فائز سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا مفتی عبدالقیوم پوپل زئی، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد گل شیر خان شہید، مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا غلام غوث ہزاروی جیسی قد آور دینی و علمی شخصیات بھی تھیں۔ جنہوں نے اپنی منفرد خطابت اور قابلِ قدر دین فہمی کے جواہر کے ذریعے عوام کے بے سمت جذبات کو قادیانیت کے خلاف منظم کر کے اُن کے ذہن و فکر کو عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کی پاسداری کے لیے تیار کیا۔

قادیانیت کے فرزندوں نے ظلم و دہشت کی فضا طاری کرنے کے علاوہ مناظرہ بازی، لالچ اور دھونس کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مجلسِ احرارِ اسلام کے رہنماؤں نے قادیانیوں کے اِن ہتھکنڈوں کا تفصیلاً جائزہ لیا اور وہ بالآخر اس فیصلے پر پہنچے کہ چونکہ قادیانیت کا خمیر انگریز کے ایماء پر اُٹھایا گیا ہے اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس فتنے کو مذہب کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا مناظروں اور مناقشوں سے حتی المقدور بچتے ہوئے قادیانیت کے دجل و فریب کو عوامی سطح پر بیان کیا جائے تاکہ وہ اَن پڑھ مسلمان جو مناظرانہ موشگافیوں اور مخصوص مذہبی اصطلاحات سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے، اُنہیں بھی قادیانیت کے ارتداد سے آشنا کیا جا سکے۔ جب احرار رہنماؤں نے قادیانیت کے مکر و عقائد کو آسان زبان میں عوام کے سامنے لا کر رکھا تو عام مسلمان بھی قادیانی مکر و فریب سے واقف ہوتا چلا گیا۔

احرار رہنما بخوبی جانتے تھے کہ قادیانیت جیسے فتنے کا صرف علمی انداز سے تعاقب کرنا اور محض کتب و رسائل کے ذریعے

اس کے نظریات وافکار کی تردید کر دینے سے ہی کما حقہ دینی فرض ادا نہیں ہو جاتا کیونکہ اس کا فائدہ چند فی صد تعلیم یافتہ مسلمانوں تک ہی محدود رہتا ہے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد جو تعلیم کی کمی کی وجہ سے کتابی علم سے استفادہ کرنے سے یکسر محروم رہ جاتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بے مثل خطابت سے کام لیتے ہوئے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور قادیانیت کی اصل غرض وغایت لوگوں کے دل ودماغ میں بیٹھا دی۔ احرار نے قادیانیت کے متعلق پڑھے لکھے مسلمانوں کو کتب ورسائل کے ذریعے شعور بخشنے میں بھی ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کی، بلکہ وہ اپنے شعبہ نشر واشاعت کے ذریعے ۱۹۳۰ء سے اب تک بے شمار لٹریچر شائع کرتی چلی آ رہی ہے۔

خورشید ندیم صاحب نے ایک اور عجیب وغریب نکتہ اعتراض اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''احرار کا ہدف بد قسمتی سے قادیانیت کی بجائے قادیانی بن گئے، کیونکہ فنِ خطابت کی ضرورت یہی تھی۔ اب بجائے یہ بتانے کے کہ قادیانیت کیسے اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، سارا زور اس پر صرف ہونے لگا کہ قادیانی کیسے اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ اس اسلوب کے غلبے سے قادیانیوں میں ایک ردِعمل پیدا ہوا، اور اُن میں اصلاح کی بجائے دفاع کا جذبہ ابھرا۔ دوسری طرف ایک عام مسلمان پر یہ اثر ہوا کہ اس میں قادیانیوں سے نفرت اور ناپسندیدگی پیدا ہوئی۔'' اگر محترم مضمون نگار قادیانیت کی پیدائش، قادیانیت کے تخلیق کاروں کے حقیقی عزائم ومقاصد اور قادیانیت کے اسلام دشمن اور ملت کش منصوبوں کا بغور مطالعہ فرماتے تو انہیں احرار کو مطعون کرنے کی ہرگز ضرورت پیش نہ آتی، کیونکہ اس ناقابلِ تردید حقیقت کو تمام دینی وسیاسی حلقے اور تاریخ دان طبقے بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ قادیانیت کی تخم ریزی کے پیچھے انگریز سامراج کے دو بڑے عزائم کارفرما تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی مرکزیت کو منہدم کرنے کے لیے جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ ختم نبوت کے برعکس سامراجی نبوت کے برگ وبار اُٹھائے جائیں اور دوسرا یہ کہ اس خانہ ساز نبوت کے ذریعے مسلمانوں کو سامراج کا مطیع وفرمانبردار غلام بنایا جائے۔ پس آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت اِنہی دو مقاصد یعنی مسلمانوں میں انتشار پھیلانے اور انگریز پرستی کو رواج دینے کا ابتدائیہ ثابت ہوا۔ جس نے آگے چل کر نوے سال تک برصغیر کے مسلمانوں کو مضطرب کیے رکھا۔

چونکہ قادیانیت کے آغاز سے ہی علماء کرام قادیانیت کے عقائد ونظریات اور اُس کے اسلام اور مسلمانوں سے متصادم فکر ونظر کی بابت تفصیل سے بتاتے چلے آئے تھے۔ اِس لیے مجلسِ احرارِ اسلام نے اس ضرورت کا احساس کیا کہ اب قادیانیت کے عقائد کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس کے قوم وملک کے خلاف دہشت گردانہ منصوبوں کو بھی طشت از بام کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مسلمان اُس کی تخریبی کارروائیوں سے بھی واقف ہو سکیں۔ اس لیے احرار نے قادیانیت کے پیروکاروں کی اسلام، مسلمانوں اور ملک کے خلاف سازشوں سے عوام کی آگاہی کو ناگزیر امر قرار دیا۔ حیرت ہے کہ فاضل مضمون نگار مجلسِ احرارِ اسلام کے اس عمل کو مسلمانوں میں قادیانیوں سے نفرت اور ناپسندیدگی پیدا ہونے کی وجہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان عوام میں قادیانیوں کے خلاف نفرت خود قادیانیوں کے مذموم عقائد اور مسموم اعمال نے ہی پیدا کی ہے۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے مسلمانوں کو ذُریۃ البغایۃ یعنی کنجریوں کی اولاد ہونے کی گالی دی۔ حتیٰ کہ مرزا قادیانی کے پوتے مرزا ناصر احمد نے ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں یہ اعتراف کیا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہ ماننے والوں یعنی مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ کیا قادیانی وڈیروں کے ایسے سینکڑوں غلیظ بیانات ہی مسلمانوں میں قادیانیوں کے

خلاف جذبات کو ہوا دینے کا باعث نہیں بنے تھے؟

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جب مجلس احرارِ اسلام نے قادیان کے مسلمانوں کی دعوت پر وہاں آل انڈیا احرار تبلیغ کانفرنس منعقد کی تو اس کانفرنس کے اثرات سے گھبرا کر قادیانیوں نے امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر مقدمہ کرا دیا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو عدالت میں بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ ''مرزائی دنیا کے اُن تمام چالیس کروڑ مسلمانوں کو جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتے، کافر کہتے ہیں۔ اس واسطے انہوں نے اپنے تمام تعلقات مسلمانوں سے منقطع کر لیے ہیں۔ اُن کی رشتہ داریاں منقطع ہو گئی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنی لڑکیاں نہیں دیتے۔ مسلمانوں کا جنازہ نہیں پڑھتے۔ ہم کو خنزیر کہتے ہیں ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو کتیوں سے بدتر کہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہمارے سے تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔'' (ہفت روزہ ''آفتاب''، ملتان ۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء) سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس بیان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے نفرت اور دُوری کی ابتدا، اور انتہاء قادیانی عناصر نے خود کی تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مذکورہ بالا مقدمہ کا فیصلہ ممتاز جج جسٹس جی، ڈی کھوسلہ نے کیا تھا۔ اس فیصلہ میں بھی فاضل جج نے قادیانیوں کو ہی مسلمانوں پر مظالم کا مرتکب اور اُنھیں مشتعل کرنے کا باعث قرار دیا تھا۔

محترم خورشید احمد ندیم نے قادیانی اور قادیانیت کی تفریق کر کے لفظی بازیگری سے کام لیا ہے۔ قادیانیت اگر مخصوص عقیدہ ونظریہ کا نام ہے تو قادیانی ہی اُس کی ترویج واشاعت کا ذریعہ ہیں۔ اگر آج فلسطینی مسلمانوں پر یہودیوں کے مظالم کی مذمت کی جاتی ہے یا یہودیوں کی سازشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو دراصل یہودیوں سے مراد یہودیت ہی ہوتی ہے۔ اس طرح اگر قادیانیوں کی مذموم سرگرمیوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو یہ درحقیقت قادیانیت ہی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اگر مجلسِ احرارِ اسلام کے رہنما قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی تقسیم کے دوران سر ظفر اللہ خان قادیانی کے باؤنڈری کمیشن میں پاکستان کا کیس خراب کرنے کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ظفر اللہ خان کے قائدِ اعظم کا جنازہ نہ پڑھنے کا حوالہ پیش کرتے ہیں اور ظفر اللہ خان قادیانی کے ہی بحیثیت وزیر خارجہ، پاکستان کو سیٹو اور سینٹو جیسے بدنامِ زمانہ معاہدوں میں جکڑ کر پاکستان کی خود مختاری کو داؤ پر لگا دینے کے متعلق حقائق واشگاف کرتے ہیں، یا اسرائیل میں قادیانیوں کے مشن کے موجود ہونے کے متعلق قادیانی رسائل کے حوالے سے عوام کو آگاہ کرتے ہیں تو یہ اُن کا دینی ہی نہیں، قومی فریضہ بھی ٹھہرتا ہے، کیونکہ دین وایمان اور قوم وملک کے دشمن کے تخریبی ارادوں سے قوم کو بروقت خبردار کرنا قوم کے سچے خیر خواہوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔

اگر اِن حقائق کو جان لینے سے قوم میں دوست، دشمن کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے اور اِس میں اپنے دین وطن کے غداروں کے کردار وعمل سے نفرت جنم لیتی ہے تو یہ ہماری دینی، قومی اور ملی غیرت کا تقاضا بھی ہے۔ دشمن کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر بھی اُسے دوست سمجھتے ہوئے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا سراسر حماقت ونادانی ہے۔ یاد رہے! کہ نادان دوست، دشمن سے کہیں زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔ اگر خورشید احمد ندیم کے فلسفہ کے مطابق قادیانیوں کی اسلام، مسلمان اور پاکستان کے خلاف سازشوں کی نقاب کشائی سے قادیانیوں کے خلاف نفرت کو فروغ ملتا ہے، تو علامہ محمد اقبالؒ کے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط میں شامل اِس جملے کے متعلق کیا کہا جائے گا کہ:

''میں اِس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں''۔

ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام کانفرنس

ہندوستان کی آزادی کے ۶۳ ویں جشن کے موقع پر ۸/اگست ۲۰۱۰ء بروز اتوار ایسٹ لندن کے معروف تعلیمی ادارے دارالامہ کے وسیع ہال میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان کانفرنس زیرِ صدارت مولانا عیسیٰ منصوری منعقد ہوئی جس کا عنوان تھا: ''برصغیر کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا کردار اور آزادی کے ۶۳ برس میں کیا کھویا کیا پایا''۔ کانفرنس میں لندن اور برطانیہ کے مختلف شہروں سے ہر طبقہ کے لوگوں خصوصاً مختلف تنظیموں، اداروں، مساجد اور اسلامک سینٹرز کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں بھارت سے میڈیا کے مشہور سہارا گروپ کے چیف ایڈیٹر جناب عزیز برنی بطورِ مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ بھارت میں اردو تفتیشی صحافت کا سہرا ڈاکٹر عزیز برنی کے سر ہے جنہوں نے گذشتہ ایک دہائی میں کمیونل دہشت گرد صحافت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ گذشتہ چند سالوں میں حیدر آباد کی مکہ مسجد، اجمیر شریف، جے پور، مالیگاؤں اور سمجھوتہ ایکسپریس کے بم دھماکے کسی مسلمان نے نہیں بلکہ ہندوتوا کے دہشت گردوں نے کیے جن میں مندر کے پروہت پجاری، بھارتی فوج کے حاضر سروس کرنل تک شامل ہیں۔ عزیز برنی کی ایک درجن سے زیادہ اردو و انگریزی تحقیقی کتب دنیا بھر میں پڑھی جا رہی ہیں۔

کانفرنس کے دوسرے مہمان خصوصی بھارت کے ممتاز عالم دین اور درجن بھر علمی و تحقیقی کتب کے مصنف جناب مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی تھے۔ ان کے علاوہ بھارت کے عظیم علمی و دینی ادارے جامعہ سید احمد شہیدؒ کھتولی (یوپی) کے استاذ جناب مولانا انعام صاحب، جنگ کے سابق ایڈیٹر جناب ظہور نیازی صاحب، شیخ الحدیث مولانا محی الدین بڑودوی، جماعت اسلامی کے ممتاز عالم و اسکالر مولانا رضوان فلاحی اردو کمپیوٹر سینٹر کے ڈائریکٹر و براڈ کاسٹر مفتی برکت اللہ، لندن شہر کے مولانا عبدالحلیم، مولانا رفیق، مفتی ابراہیم کاوی، حافظ عبدالرشید کاوی، مولانا مسعود عالم، معروف ادیب و شاعر کامران رعد، ورلڈ سینٹر اسلامک فورم کے سیکریٹری جناب جعفر، خزانچی غلام قادر صاحب، انڈین مسلم فیڈریشن کے نائب صدر عرفان مصطفیٰ، فیڈریشن کے ٹرسٹی جناب شیخ یوسف، انور شریف اور ان کے علاوہ برطانیہ کے مختلف شہروں سے نمائندہ شخصیات نے شرکت کی۔

کانفرنس کا آغاز جناب حافظ عبدالرشید کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد جناب مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں مسلم سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی علمی و دینی بیداری اور نشأۃ ثانیہ کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور آپ کے خانوادہ کے سر ہے۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے انگریز حکومت کے خلاف برصغیر کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ اس کے بعد برصغیر میں حصول آزادی کے لیے تقریباً ۲۰۰ رسالہ مسلمانوں کی قربانیوں اور سرفروشی کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ منہج

خلافت راشدہ پر اسلامی حکومت کا قیام کے لیے شاہ ولی اللہؒ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی کی قیادت میں سینکڑوں علما وصلحا نے ارض بالاکوٹ کو اپنے مقدس خون سے لالہ زار بنایا۔ پھر علماء صادق پور، علماء فرنگی محل، مولانا احمد اللہ مدراسی کے جہاد کا تسلسل قائم رہا۔ ۱۸۵۷ء کے موقع پر ۵۸ ہزار علماء کو شہید کیا گیا اور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔ دہلی سے سرحد تک سات سو میل تک درختوں پر علماء حق کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ شاملی کے میدان میں علماء حق نے انگریزی فوج کا مردانہ مقابلہ کیا جس کے سالار اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، امام ربّانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور بانی دیوبند حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی تھے۔ شاملی کے میدان میں حضرت پیر ضامنؒ سمیت سینکڑوں علماء ومحدثین نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کے بعد تحریک آزادی میں مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی جدجہد کی طویل تاریخ ہے۔ مفتی صاحب نے نہایت موثر انداز میں برصغیر کی تحریک آزادی میں مسلمانوں اور خاص طور پر علماء حق کی قربانیوں اور کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر عزیز برنی نے موجودہ حالات کے تناظر میں عالمِ اسلام کا جائزہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آج عالمی طاقتوں بالخصوص امریکہ ومغرب نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے میڈیا و پروپیگنڈہ کے ذریعہ دہشت گردی کا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خود امریکہ و یورپ نے مسلم ممالک میں ریاستی دہشت گردی شروع کر رکھی ہے۔ مغرب کی اسلام دشمنی طاقتوں نے ۹/۱۱ کا واقعہ انجام دے کر الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی اہلیت، اتنی سائنس وٹیکنالوجی ہے ہی نہیں کہ وہ ایسا واقعہ انجام دے سکیں۔ بعد میں امریکہ، جرمنی، فرانس، جاپان، برطانیہ کے متعدد تفتیشی اداروں اور اسکالرز نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ۹/۱۱ کا واقعہ مسلمانوں پر الزام ڈال کر مسلم ممالک میں مداخلت کا بہانہ بنانے کے لیے خود امریکہ کی اندرونی اسلام دشمن قوتوں نے انجام دیا۔ اس المناک واقعہ میں کوئی افغانی شریک نہیں تھا، پھر بھی امریکہ ویورپین افواج نے افغانستان کو تباہ کر کے دو ملین سے زیادہ بے قصور مسلمانوں کو قتل اور کئی ملین کو معذور وجلاوطن کر دیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور امریکی یوروپی ممالک تسلیم کر چکے ہیں کہ اسرائیلی موساد کے کہنے پر امریکی سی آئی اے نے عراق میں تباہ کن اسلحہ کی جھوٹی دستاویز تیار کی تھی جسے بہانہ بنا کر عراق کو تباہ کر دیا گیا اور دو ملین سے زیادہ بے قصور مسلمانوں کو قتل اور پانچ ملین سے زیادہ کو معذور وجلاوطن کر دیا گیا۔

ڈاکٹر برنی نے کہا کہ اسرائیل آئے دن معصوم فلسطینیوں کی بستیوں کو بلڈوزر کے ذریعے مسمار کر کے وہاں اسرائیلی بستیاں بسا رہا ہے۔ بے قصور فلسطینیوں کو اسرائیل فوج و پولیس قتل کر رہی ہے۔ اسرائیل نے پوری فلسطینی آبادی کو امریکہ کی بدنام زمانہ 'گونٹانا موبے' کی طرح اذیت ناک جیل وقید خانہ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ انہیں بجلی، پانی، خوراک حتی کہ دواؤں تک سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ سب عالمی برادری بالخصوص امریکہ ویوروپ کی مجرمانہ خاموشی، درپردہ اسرائیل کی حمایت کے سبب ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر برنی نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ بھی اس لیے سلگ رہا ہے اور حل نہیں ہو پا رہا ہے کہ کانگریس سمیت بھارت کی تمام سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے ہر معاملہ کو کمیونل اور فرقہ وارانہ رنگ دیتی ہے، جب کہ کشمیر اٹوٹ انگ ہے اور کشمیری خوشی سے آپ کے ساتھ آئے ہیں۔ پھر جب وہ فریاد اور شکایت کرتے ہیں تو ان کی دادرسی کرنے کے بجائے کانگریس مٹھی بھر کمیونل برہمن وادی طاقتوں سے ڈر کر کشمیریوں کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کرتی ہے۔ جب تک کانگریس اور سیکولر پارٹیاں اپنی ذہنیت نہیں بدلیں گی اور آر ایس ایس کی خوشنودی کے لیے کشمیریوں پر جبر وظلم کے فیصلے تھوپتی رہیں گی، کشمیر کا مسئلہ کبھی حل نہیں

ہوگا۔ آپ کو یہ کہنا ہوگا کہ صرف کشمیر کی سرزمین نہیں بلکہ کشمیری ہمارے بھائی ہیں۔

ڈاکٹر برنی نے کہا کہ میں نے پہلے ہی دن کہا تھا کہ ممبئی دہشت گردی کے واقعہ میں صرف دس آدمی نہیں، امریکہ اور بھارت کی کمیونل طاقتیں بھی شریک ہیں۔ بعد میں امریکی ایجنٹ ہیڈلی اور بھارتی آئی بی کے مشکوک کردار نے میری بات کو ثابت کیا۔ ہمیں پوری انسانیت کو ایک کنبہ تصور کر کے ہمدردی اور حقیقت پسندی کے ساتھ مسائل سے نمٹنا ہوگا۔ جب تک بھارت میں گانگریس مہاتما گاندھی اور نہرو کے سیکولر راستے کے بجائے آر ایس ایس اور ہندو کمیونل طاقتوں کی خوشنودی کے لیے کام کرے گی، ہندو مسلم کشیدگی و نفرت کا الاؤ بھڑکتا رہے گا۔ ہر فرقہ وارانہ فساد میں ۹۰، ۹۵ فیصد مسلمانوں کا نقصان کیوں ہوتا ہے؟ ہر فساد نے ثابت کیا ہے کہ انتظامیہ اور پولیس میں خاصی تعداد میں آر ایس ایس کے کمیونل ذہن کے لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے قتل و تباہی میں خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ جب تک یہ ذہنیت نہیں بدلے گی، وطن عزیز میں ہندو مسلم یکجہتی و بھائی چارہ رواداری اور محبت و پیار سے مل جل کر رہنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

صدر جلسہ مولانا عیسیٰ منصوری نے کہا کہ برصغیر کی تعریف ساری دنیا میں نرالی و عجیب و غریب ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں مسلمانوں کی تعداد پانچ فیصد بھی نہیں رہی مگر پوری مدت میں ایک واقعہ بھی نہیں ملتا کہ ہندو عوام نے کبھی مسلم اقتدار کے خلاف بغاوت کی ہو۔ بھارت کی ہزار سالہ تاریخ میں جنگیں سیاسی اور اقتدار کی جنگیں کی تھیں نہ کہ مذہب کی۔ بھارت کی ہزار سالہ تاریخ میں کئی بار مسلمانوں نے سیاسی شکست کھائی مگر پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی نہیں ملتا کہ کسی ہندو نے اسلام یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہو یا رنگیلا رسول جیسی بدبختانہ کتاب لکھی ہو۔ یہ نفرت کا بیج انگریزوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے بویا۔ آج بھارت کی آر ایس ایس اور شیو سینا، بجرنگ دل، سب انگریز کی پیداوار ہیں، ان کا جنگ آزادی میں ذرہ برابر کردار نہیں، جبکہ بھارت میں مسلمانوں کی ملک کی آزادی کے لیے ۲۰۰ سو سالہ شاندار تاریخ ہے۔ بنگال کے نواب سراج الدولہ کی شہادت ۱۷۹۹ء میں اور بالاکوٹ میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کے ساتھ سیکڑوں علما کی شہادت، ۱۸۳۱ کا واقعہ ہے۔ ۱۷۹۹ میں سلطان ٹیپو شہید کی شہادت کے بعد انگریز فوج کا سالار خوشی سے چلا اٹھا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔ جنگ آزادی میں سب سے عظیم اور تابناک کردار علماء حق کا ہے جس کا تسلسل حاجی امداد اللہ مکیؒ سے ہوتا ہوا شیخ الہند محمود حسنؒ دیوبندی، مولانا آزاد اور حضرت مدنیؒ تک ہے۔

مولانا منصوری نے کہا کہ آپ کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ آپ اللہ سے اپنا رشتہ مضبوط کریں اور اللہ کا سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امانت اور ذمہ داری آپ کو سونپی ہے، دنیا کے ہر انسان تک قرآن کا پیغام اور ایمان، اسلام اور توحید کی دعوت پہنچائیں۔ جب تک ہم اپنا اصل کام نہیں کریں گے یعنی اللہ رسول کا پیغام ہر انسان تک نہیں پہنچائیں گے، اسی طرح تباہ و برباد رہیں گے۔ بلاشبہ بھارت میں ہمارے بے شمار مسائل ہیں، ناانصافیوں اور ظلم کی ۶۳ سالہ تاریخ ہے۔ تعلیمی پسماندگی، بے انتہا غربت، ہر معاملہ میں ناانصافی و ظلم مثلاً پارلیمنٹ میں سو کے بجائے ۲۵ سیٹیں، ملازمتوں فوج، پولیس میں ۱۵ فیصد کے بجائے بمشکل دو فیصد، فسادات کے عنوان سے نسل کشی و تباہی، مگر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ فلسطینیوں کی طرح سو فیصد تعلیم یافتہ ہو جائیں، تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک کی طرح مالدار بن جائیں، ملازمتوں میں ۲۰ فی صد ریزرویشن مل جائے، بھارتی پارلیمنٹ میں آپ کی سو سیٹیں ہو جائیں، تب بھی اسی طرح برباد رہیں گے جب تک اپنی اصل ذمہ داری کا احساس نہ کریں، یعنی ایمان و اسلام کی دعوت کے لیے کھڑے نہ ہوں۔

مولانا منصوری نے کہا کہ آپ کی اصل پہچان اور حیثیت داعی کی ہے اور داعی تاجر کی طرح ہوتا ہے۔ تاجر اپنا مال بیچنے کی خاطر گاہک کی ہزار بدتمیزی و بے ہودگی برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا دین پہنچانے کے لیے آپ کو بھی برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ کی دوکان نہیں چلتی تو آپ یہ کہہ کر بند نہیں کر دیتے کہ گاہک نہیں آ رہے، بلکہ ناکامی کے اسباب پر غور کر کے امکان بھر جدوجہد میں لگ جاتے ہیں۔ اگر اسٹاف نااہل ہے تو اسے تبدیل کرتے ہیں، دکان کا ڈیکوریشن، فرنیچر ترغیب دلانے والا نہیں تو اسے بدلتے ہیں، دوکان کا سامان بدلتے ہیں، دوکان کی جگہ تبدیل کرتے ہیں، پھر بھی نہ چلے تو ایڈورٹائزنگ کے جدید ترین ذرائع اختیار کرتے ہیں حتیٰ کہ دکان چل پڑتی ہے، مگر جب اللہ کے بندوں کو اس کا پیغام پہچانے کا مسئلہ درپیش ہو تو صدیوں پرانے فرسودہ طریقوں اور اسلوب پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو کہ کیا کریں، لوگ دینی کتابیں پڑھتے ہی نہیں! دین کی بات کی بات سنتے ہی نہیں! آپ تجارت میں بہت ہوشیار اور دعوت میں نااہل بن جاتے ہیں۔

آج ہم ہر جگہ اپنی مظلومیت کا رونا رو رہے ہیں کہ فلسطین میں ہمارے ساتھ یہ ظلم ہو گیا، چیچنیا میں یہ ظلم ہو گیا، کشمیر میں یہ ظلم ہو گیا، آپ انسانوں کی نظروں میں مظلوم مگر اللہ کے نزدیک ظالم ہیں کہ اللہ نے آپ کو دنیا کے ہر انسان کے لیے ہمیشہ کی فلاح و کامیابی اور ہمیشہ ہمیشہ کی ناکامی و بربادی سے بچنے کا نسخہ شفا قرآن اور اسلام کی شکل میں دیا تھا۔ آج لاکھوں مسلمان مر مر کر ہمیشہ ہمیشہ کی ہلاکت و بربادی یعنی جہنم میں جا رہے ہیں، آپ نے ان کی فکر نہیں کی، ان پر رحم نہیں کیا، اپنی دنیا بنانے میں لگے رہے تو اللہ نے سزا کے طور پر ان لوگوں کو استعمال کر کے آپ کی دنیا کو جہنم بنا دیا۔ آج دنیا میں پوری انسانیت ظلم و بربریت کی چکی میں پس رہی ہے، اس کے ذمہ دار ہم اور آپ ہیں۔ اب ان کی نجات کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح فرمان کے مطابق دنیا کے ہر انسان سے آپ کا خونی رشتہ ہے کہ وہ بنی آدم ہے۔ وہ آپ کے حریف نہیں، رحم کے مستحق ہیں، آپ کو ایمان اور اسلام کی دعوت لے کر اٹھنا ہوگا، ورنہ اسپین کی طرح برطانیہ، یورپ، امریکہ ہی میں نہیں، پوری دنیا میں آپ بربادی اور ہلاکت سے نہیں بچ سکتے۔

اجلاس میں مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی کی تازہ تصنیف ''ذکرا قائما'' جو علماء گجرات کی علمی و دینی خدمات پر مشتمل ہے کی رونمائی ڈاکٹر عزیز برنی، مولانا منصوری، مولانا عثمانی اور سابق ایڈیٹر روزنامہ جنگ لندن جناب ظہور نیازی کے ہاتھوں ہوئی۔ آخر میں ورلڈ اسلامک فورم کی طرف سے ڈاکٹر عزیز برنی کو ان کی جرأت و بے باکی اور خدمات پر مولانا محمد علی جوہر ایواڈ، مولانا منصوری، مولانا عثمانی اور ظہور نیازی صاحب کے ہاتھوں دیا گیا۔ اجلاس اسی ایواڈ کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

بھارت میں ''مشترکہ خاندانی قوانین'' کا ایک مجوزہ منظر

لیجیے، یونیفارم سول کوڈ تیار ہے۔ مردوں اور عورتوں سب کو تعدد ازدواج کا حق دیا جا رہا ہے۔ مرد بھی بیک وقت کئی شادیاں کر کے کئی بیویاں رکھ سکتے ہیں اور اسی طرح عورتیں بھی کئی کئی شادیاں کر کے بیک وقت کئی کئی شوہر رکھ سکتی ہیں۔ اس کے لیے راجیہ سبھا میں ایک پرائیویٹ بل پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ بل بی جے پی کے ممبر پارلیمنٹ، سابق گورنر اور پنجاب و ہریانہ کے سابق چیف جسٹس ایم راما جوئس نے پیش کیا ہے۔ (دی سنڈے گارجین، ۱۸ جولائی)

بی جے پی ایک زمانے سے یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے لیے تحریک چلا رہی ہے۔ اس کے لیے طرح طرح کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ خود آئین سازوں نے بھی آرٹیکل ۴۴ میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو حکومت کی بنیادی ذمہ داری

قرار دیا ہے۔ بی جے پی کے ایک ممبر نے اس کے لیے عملی قدم اٹھا دیا ہے۔ جو مردوں اور عورتوں کو تعدد ازدواج کے معاملے میں مساوی حق اور برابری کا درجہ دینے کے قائل ہیں، وہ اس بل کے ذریعے عورتوں کے خلاف مذہب یا جنس کی بنیاد پر امتیاز کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس بل کے ذریعے شادی اور طلاق کے سلسلے میں ایسا قانون بنانا چاہتے ہیں جس میں مختلف مذاہب کے احکام وتعلیمات کو یکجا کر دیا جائے گا۔ اس بل میں دوسری شادی کا راستہ نکال کر طلاقوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مسئلے پر قابو پانے کا خواب دیکھا گیا ہے کہ ایک مرد یا عورت اپنے موجود شریک حیات کی مرضی سے طلاق لیے بغیر دوسری شادی کر سکتا اور کر سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تعدد ازدواج موجودہ قانون کے تحت مردوں اور عورتوں کے لیے ناممکن ہے جب تک کہ وہ طلاق نہ لے لیں، لیکن بہرحال زندگی میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جب خاندان یا جوڑے کے لیے دوسری شادی لازمی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی دونوں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے بیوی کسی ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگوں سے محروم ہو جاتی ہے، تب وہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے لازمی فرائض ادا نہیں کر پاتی۔ اگر وہ چاہے تو اس کا شوہر دوسری شادی کر سکتا ہے، لیکن موجودہ قوانین طلاق کے بغیر اس طرح کی شادی کی اجازت نہیں دیتے، باوجودیکہ مختلف علیحدہ علیحدہ قوانین موجود ہیں۔

واضح رہے کہ خاندانی پراپرٹی میں افراد کے حقوق، حق وراثت، اقلیت، سرپرستی، شادی اور طلاق سے متعلق قوانین سول کوڈ کہلاتے ہیں۔ ان میں شادی اور طلاق سے متعلق قوانین بہت اہمیت کے حامل ہیں اور اس سلسلے میں آئین کے نفاذ سے پہلے کے بھی اور بعد کے بھی دونوں وقتوں کے اور مختلف قسم کے قوانین موجود ہیں۔ ہندو شادی ایکٹ ۱۹۵۵ء، اسپیشل شادی ایکٹ ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۳ء کا ایکٹ نمبر ۳۲، ۱۹۴۹ء کا ایکٹ نمبر ۳۳، ۱۹۷۰ء کا نمبر ۲۹ اور ۱۹۷۶ء کا نمبر ۶۸، انڈین کرسچین میرج ایکٹ ۱۸۷۲ء، پارسی شادی وطلاق ایکٹ ۱۹۳۶ء اور مسلم نکاح وطلاق کی ایکٹ ۱۹۵۱ء۔ ان تمام باتوں کا ذکر کرتے ہوئے بل میں کہا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے پارلیمنٹ نے آئین کے نفاذ کے بعد کوئی قانون نہیں بنایا ہے۔ شادی اور طلاق سے متعلق مسلم پرسنل لاء ایک مرد کو بیک وقت چار بیویاں رکھنے کا حق دیتا ہے اور پھر شوہر کو یک طرفہ طور پر زبانی الفاظ کہہ کر بیوی کو طلاق دے دینے کا حق بھی دیتا ہے۔ یہ قوانین امتیاز پر مبنی ہیں اور عورتوں کے خلاف ہیں، جبکہ آئین کا آرٹیکل ۱۵ اجنس اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

یاد رہے کہ کوئی بھی ممبر پارلیمنٹ جو وزیر نہ ہو، اگر پارلیمنٹ میں کوئی بل پیش کرتا ہے تو اس کو پرائیویٹ بل کہا جاتا ہے اور ۱۹۷۰ء کے بعد سے پارلیمنٹ نے کوئی پرائیویٹ بل پاس نہیں کیا ہے، لیکن ایک ایسے وقت میں جب مختلف کھاپ اندرون گوتر شادی کے خلاف قانون قرار دیے جانے کے لیے تحریک چلا رہی ہیں، جنسی انارکی و بے راہ روی کے نتیجے میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جنون عشق کا طوفان برپا ہے، وہ گھر سے فرار ہو کر من مانے طریقے سے شادیاں رچا رہے ہیں اور مغربی دنیا کی تقلید کرتے ہوئے پارٹنر شپ، کورٹ شپ کی راہ اختیار کر رہے ہیں اور اب بالخصوص قومی راج دھانی دہلی اور اس کے اردگرد اور بالعموم پورے ملک میں ناموس کے نام پر قتل کے واقعات کا سلسلہ روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے، حکومت ہندو میرج ایکٹ میں ترمیم پر غور کر رہی ہے، اس بل کو یقیناً زیر بحث لایا جائے گا۔ مختلف فرقے، مذاہب اور تہذیبوں کے ماننے والے اس کو کہاں تک قبول کرتے ہیں، دیکھنے کی بات ہے۔ تاہم مسلمانوں کو جو قرآن وسنت کے احکام وتعلیمات پر ایمان وعقیدہ رکھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں، ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ (سہ روزہ ''دعوت'' دہلی)

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی سالانہ رپورٹ

(شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ تا رجب ۱۴۳۱ھ۔ جولائی ۲۰۰۹ء تا جون ۲۰۱۰ء)

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ ۱۹۸۹ء سے اسلام کی دعوت وتبلیغ، اسلام مخالف لابیوں کی نشان دہی اوران کی سرگرمیوں کے تعاقب، اسلامی احکام وقوانین پر کیے جانے والے اعتراضات وشبہات کے ازالہ، دینی حلقوں میں باہمی رابطہ ومشاورت کے فروغ اورنوجوان نسل کی فکری وعلمی تربیت وراہ نمائی کے لیے مصروف کار ہے۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے صدر مدرس مولانا زاہد الراشدی اکادمی کے ڈائریکٹر ہیں جبکہ حافظ محمد عمار خان ناصر (فاضل وفاق المدارس العربیہ، ایم اے انگلش پنجاب یونیورسٹی) ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر ان کی معاونت کرتے ہیں۔

اکادمی کی سال رواں کی رپورٹ احباب ومعاونین کی خدمت میں پیش ہے:

اکادمی کے زیر اہتمام دینی مراکز ٥ ۱۹۹۹ سے جی ٹی روڈ گوجرانوالہ پر کنگنی والا بائی پاس کے قریب سرتاج فین کے عقب میں ہاشمی کالونی میں اکادمی کی تین منزلہ عمارت اس وقت اکادمی کی بیشتر تعلیمی اور علمی وفکری سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مسجد خدیجۃ الکبریٰ کے علاوہ اکادمی کے دفاتر، لائبریری اور الشریعہ فری ڈسپنسری اسی مرکز میں قائم ہیں۔

٥ کینال ویو واپڈا ٹاؤن کے عقب میں کوروٹانہ کے مقام پر کھیالی کے مخیّر دوست حاجی ثناء اللہ طیب نے الشریعہ اکادمی کے لیے ایک ایکڑ (آٹھ کنال) زمین وقف کی ہے جہاں تقریباً دس لاکھ روپے کی لاگت سے، چار دیواری کی بنیادیں بھرنے کے علاوہ مدرسہ طیبہ تحفیظ القرآن کا ایک بلاک بھی تعمیر کیا جا چکا ہے۔

تعلیمی سرگرمیاں ٥ مسجد خدیجۃ الکبریٰ، کنگنی والا میں پنج گانہ نماز باجماعت کے ساتھ فجر کے بعد اسکول کے طلبہ وطالبات کے لیے ناظرہ قرآن کی کلاس مستقل طور پر جاری ہے۔

٥ مدرسہ طیبہ تحفیظ القرآن، کوروٹانہ میں پرائمری پاس طلبہ کے لیے حفظ قرآن کریم مع مڈل کی کلاس جاری ہے۔

٥ میٹرک پاس طالبات کے لیے وفاق المدارس کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق طالبات کے لیے درس نظامی اور دراسات دینیہ کورس کے مختلف درجات کی تعلیم جاری ہے۔ طالبات کو تجوید کی ضروری تعلیم دینے کے علاوہ عربی ادب وانشا کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

٥ اسکول وکالج کے طلبہ کے لیے عربی گریمر کے ساتھ ترجمہ قرآن مجید کی کلاسز کا سلسلہ بحمد اللہ جاری ہے۔ اب تک طلبہ کی چار جبکہ طالبات کی دو کلاسز ترجمہ قرآن مجید مکمل کر چکی ہیں۔

o فروری/مارچ ۲۰۱۰ء میں اکادمی کے زیر اہتمام شہر کے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں عربی اور انگریزی لینگویج کورسز کا انعقاد کیا گیا جن میں اکادمی کے رفیق مولانا حافظ محمد یوسف دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو انگریزی اور عربی بول چال کی تعلیم دی۔ ان کورسز میں مجموعی طور پر ۴۰ کے قریب طلبہ نے شرکت کی۔

o اکادمی کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی نے دینی مدارس کے اعلیٰ درجات کے طلبہ کو شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے منتخب ابواب کی تدریس کی۔

دعوت و ابلاغ o علمی وفکری جریدہ ماہنامہ ''الشریعۃ'' پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جس میں ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل ومشکلات اور جدید علمی وفکری چیلنجز کے حوالہ سے ممتاز اصحاب قلم کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔

o اردو زبان میں دو اسلامی ویب سائٹ پہلے سے کام کر رہی ہیں۔ www.alsharia.org پر ماہنامہ ''الشریعۃ'' کے علاوہ مختلف اہم عنوانات پر منتخب مقالات ومضامین ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، جبکہ www.hajjatulwada.com پر خطبہ حجۃ الوداع کا جامع متن اور خطبے کے حوالے سے مولانا زاہد الراشدی کے محاضرات پڑھے جا سکتے ہیں۔ گزشتہ سال کے دوران میں www.sarfrazsafdar.org اور www.abdulhameedsawati.org کے عنوان سے دو مزید ویب سائٹس قائم کی گئیں جن پر شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور مفسر قرآن مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کے حالات زندگی اور خدمات کے علاوہ ان کے علمی افادات بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

نشر و اشاعت o ۲۰۰۷ میں اکادمی کے شعبہ نشر واشاعت کے زیر اہتمام اہم علمی وفکری موضوعات پر مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کے تحت اب تک اکادمی کی طرف سے ڈیڑھ درجن کے قریب کتب اور کتابچے شائع کیے جا چکے ہیں۔ گزشتہ سال کے دوران میں دو اہم مطبوعات منظر عام پر لائی گئیں:

☆ ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت (بیاد حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر) ضخامت: ۱۰۰۰ صفحات۔

☆ ''مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم'' (خطبات ومحاضرات: ڈاکٹر محمود احمد غازی) ضخامت: ۲۵۶ صفحات۔

علمی وفکری نشستیں o گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی اکادمی کے زیر اہتمام ہفتہ وار فکری نشستوں کا اہتمام کیا گیا جن میں اکادمی ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی نے اپنی یادداشتیں بیان کیں۔

o ۴/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی یاد میں شائع ہونے والی، ماہنامہ 'الشریعۃ' کی خصوصی اشاعت کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر حافظ خالد محمود نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر حافظ محمود اختر (چیئرمین شیخ زاید اسلامک سنٹر لاہور) شریک ہوئے۔ تقریب سے گفتگو کرتے ہوئے مختلف ارباب علم ودانش نے حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی شخصیت وخدمات اور 'الشریعۃ' کی خصوصی اشاعت کے حوالے سے اپنے احساسات وتاثرات کا اظہار کیا۔ بزرگ عالم دین مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے تقریب کے اختتام پر دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے۔

o ۱۲/فروری کو مولانا سید عدنان کاکاخیل جامعۃ الرشید کے ایک وفد کے ہمراہ تعلیمی دورے پر گوجرانوالہ تشریف لائے اور ''الشریعہ اکادمی'' میں حاضرین سے ایک مختصر خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ عصر حاضر کو ڈائیلاگ کا دور کہا جاتا ہے اور ایسے اداروں کی بہت زیادہ ضرورت ہے جو اس کلچر کو رواج دیں۔ انھوں نے کہا کہ الشریعہ اکادمی نے ایک چھوٹے شہر سے ایک

بڑے کام کی ابتدا کی ہے اور ایس کی بنیاد اس سوچ اور فکر پر ہے کہ دلیل اور حجت سے بات ہونی چاہیے اور بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

o یکم مارچ کو اکادمی میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ایک مختصر تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں عوام الناس کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب میں خصوصی خطاب مولانا عبدالواحد رسول نگری نے فرمایا جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مسلم لیگ (ن) کے سرکردہ رہنما اور ممبر قومی اسمبلی جناب عثمان ابراہیم مدعو تھے۔ مولانا عبدالواحد رسول نگری نے کہا کہ سیرت کی محفلوں میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہیے تاکہ سننے والوں میں معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ جناب عثمان ابراہیم نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج ہمیں جن ناموافق حالات کا سامنا ہے، وہ اسی صورت میں سازگار بن سکتے ہیں جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو مشعل راہ نا کر اپنی نجی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کی تعمیر کریں گے۔

o ۲۱/ مارچ کو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ مجاز مولانا عبدالحفیظ مکی بعد از نماز مغرب الشریعہ اکادمی میں تشریف لائے اور حاضرین سے مختصر خطاب فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت حق و باطل کا ایک ایک معرکہ برپا ہے اور ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے، بلکہ حق و باطل کے درمیان برپا اس معرکے میں ہمت اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دینے کی تیاری کرنی چاہیے اور اللہ کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ اس شر میں سے ہمارے لیے ضرور خیر پیدا فرمائے گا۔

o ۸/ مئی کو حضرت مولانا خواجہ خان محمد سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں کی وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت بزرگ عالم دین مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی اور پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی، جمعیۃ علماے اسلام (س) پنجاب کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالرؤف فاروقی اور الشریعہ اکادمی کے مولانا حافظ محمد یوسف نے خطاب کیا۔ تعزیتی نشست میں علماے کرام، دینی مدارس اور کالجوں کے اساتذہ اور مختلف طبقات کے افراد نے شرکت کی اور آخر میں حضرت مرحوم کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے دعا کی گئی۔

<u>رفاہ عامہ</u> o الشریعہ اکادمی کے زیر انتظام ہاشمی کالونی میں فری ڈسپنسری روزانہ عصر تا عشا کام کرتی ہے اور روزانہ اوسطاً ۷۰ مریض اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

<u>اخراجات</u> اکادمی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے اور تمام اخراجات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ احباب و معاونین کے مخلصانہ تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ اصحاب خیر سے گزارش ہے کہ خصوصی توجہ فرمائیں اور انتظامی، تعلیمی و تعمیری اخراجات میں تعاون فرما کر اپنے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ کریں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

امراض وعلاج

حکیم محمد عمران مغل بی اے*

*فاضل عربی، لاہور بورڈ۔ مستند درجہ اول، طبیہ کالج لاہور۔

جملہ امراض کے علاج کے سلسلے میں رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ 0333-4058503

میری معالجاتی کتاب کا ایک نایاب ورق

['الشریعۃ' کے ابتدائی شماروں میں ''امراض وعلاج'' کے عنوان سے ایک مستقل کالم شائع ہوتا رہا ہے جس میں پیچیدہ امراض کے علاج کے حوالے سے طب مشرق کے تجربات وتحقیقات قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں۔ کئی سال کے تعطل کے بعد حکیم محمد عمران مغل صاحب نے اس سلسلے میں اپنی خدمات دوبارہ پیش کی ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اسے مفید پائیں گے۔ (مدیر)]

پرانے اطبا نے پیچیدہ امراض کے ازالہ کے لیے انتہائی سستے نسخے ترتیب دیے۔ اسی طرح کا ایک نسخہ ایک ایسے مریض پر استعمال کیا گیا جو موجودہ طریق علاج سے عاجز آ چکا تھا۔ یہ واقعہ ماہنامہ ''اسرار حکمت'' لاہور میں تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے دوبارہ لکھا جا رہا ہے۔

دائمی قبض کا مریض جو آپریشن کے لیے خپلو (جہاں سے چین کی سرحد شروع ہو جاتی ہے) سے گلگت، اسکردو، بلتستان، مانسہرہ، ایبٹ آباد، خیبر پختون خواہ، راول پنڈی تمام پنجاب سے بڑے بڑے معالجین سے علاج کرانے کے بعد آخری علاج کے طور پر لاہور کے سب سے بڑے میو ہسپتال میں آپریشن کے لیے پہنچا۔ ہسپتال کی بغل میں ایک تاریخی مسجد اور مدرسہ نیلا گنبد مشہور ہے۔ یہ مریض ایک نہایت متقی، پرہیز گار عالم بھی تھے اور اسی مسجد میں نماز ادا فرماتے۔ میرا قیام بھی بغرض فاضل عربی اور تکمیل طب یہیں تھا۔ مولوی صاحب کا نوجوان بھانجا ہسپتال میں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ آپریشن کے تمام مراحل طے ہو چکے تھے۔ تکلیف یہ تھی کہ انھیں کئی کئی دن پاخانہ کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔ انھیں کسی بھی علاج سے افاقہ نہ ہوا۔

کسی صاحب نے انھیں میرے پاس بھیجا۔ میں ابھی طبیہ کالج میں دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ میں نے اپنی کم علمی کا اظہار کیا تو فرمانے لگے کہ اپنے اساتذہ کرام سے عرض کریں۔ میں نے کچھ مہلت چاہی، غور وفکر کے بعد میں نے ہامی بھر لی۔ ایک تیز اور تند نسخہ جو مجھے ایک کرم فرمانے عطا کیا تھا جس کی ایک گولی اپنا اثر دکھلاتی ہے، میں نے انھیں رات کو تین گولیاں نیم گرم دودھ سے دیں مگر بے فائدہ۔ صبح پھر چھ گولیاں دیں مگر بے اثر۔ میں نے سوچا کہ یہ

برفانی انسان ہیں، خوراک بڑھاتے بڑھاتے ایک رات کو بارہ گولیاں دے کر اللہ کے دربار میں دعا بھی کرتا رہا کہ یہ عالم دین آپریشن سے بچ جائیں اور نقصان بھی نہ ہو۔ صبح وہ اپنے نوجوان بھانجے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تشریف لائے تو خوشی کا ایسا سماں تھا کہ گماں میں بھی نہ تھا۔ رات بھر وقفہ وقفہ سے پاخانہ آتا رہا۔ صبح طبیعت بالکل صاف تھی۔

میری بھی خوشی کی انتہا نہ تھی کہ ابھی طفل مکتب تھا اور اللہ نے میرے ہاتھوں کارنامہ انجام دیا۔ آپریشن کے تمام لوازمات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہسپتال کے دیگر حضرات بھی انھیں دیکھنے کو آتے رہے۔ جاتے جاتے انھوں نے مجھ سے دو کلو کے لگ بھگ دوا تیار کرائی۔ نسخہ بالکل سادہ مگر انتہائی سستا تھا۔ میں نے اس پر مزید تحقیق کر کے گلے کے کینسر تک کا علاج کیا ہے جو ان شاء اللہ قارئین 'الشریعہ' کی نذر کیا جائے گا۔

نسخہ سنیے اور سر دھنیے:

کوڑتمہ یعنی حنظل خشک کے بیج الگ کر کے اس کے ہم وزن منقی کے بیج نکال کر کوٹ لیں اور چنے کے برابر گولیاں بنالیں۔ قبض کے علاوہ دیگر امراض بھی دور ہوں گے، جیسے گنٹھیا، نزلہ زکام، تمام بلغمی امراض وغیرہ۔ رات کھانے کے بعد دودھ یا پانی سے ایک تا تین گولیاں دے سکتے ہیں۔

شیخ المشائخ، خواجہ خواجگان حضرت مولانا

خواجہ خان محمد نوراللہ مرقدہ کی حیات وخدمات پر

مجلّہ ''صفدر'' (گجرات) کا شیخ المشائخ نمبر

طبع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔

صفحات: 876۔ رعایتی قیمت: 300 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

برائے رابطہ:

ا۔ حمزہ احسانی۔ مظہریہ دارالمطالعہ۔ حق چاریار اکیڈمی، مدرسہ حیات النبی گجرات۔ 0334-4612774

۲۔ حافظ محمد طاہر۔ مکتبہ امام اہل سنت، جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ۔ 0306-6426001

۳۔ قاری عبدالستار۔ ناظم مدرسہ تعلیم القرآن حسینیہ، متصل نیازی میڈیکل ٹاور، سرگودھا۔ 0300-9606429

مسائل جدیدہ کے بارے میں

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا نقطہ نظر

''ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! اگر ایک رسالہ ایسا اور لکھا جاتا کہ جس میں ہر پیشہ ور کے معاملات کے احکام کو اس میں شرعی حیثیت سے بصورت مسائل بیان کر دیا جاتا تو بڑی سہولت ہو جاتی، اس لیے کہ لین دین وغیرہ میں آج کل نئی نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اکثر احکام شرعیہ کے خلاف عمل درآمد ہو رہا ہے اور ان سے اجتناب کرنے کو لوگ دشوار سمجھتے ہیں۔ یہ سب مشکلیں حل ہو جاتیں۔ فرمایا کہ آپ آج یہ کہہ رہے ہیں، میں نے تو ایک عرصہ ہوا، اس وقت چاہا تھا کہ سب اہل معاملہ اپنے اپنے معاملات کو سوال کی صورت میں جمع کر کے مجھ کو دے دیں، چاہے وہ تجارت پیشہ ہو یا زراعت پیشہ یا ملازمت پیشہ وغیرہ وغیرہ۔ میں کوشش کر کے ان کے متعلق روایتیں جمع کر دوں گا اور احکام بتلا دوں گا، مگر کسی نے میری مدد نہ کی۔ بڑے کام کی کتاب ہوتی۔

اسی کے متعلق میں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا تھا کہ اگر کثیرۃ الوقوع معاملات پر دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتویٰ دیا جائے تو کوئی تو نہیں ہے؟ حضرت نے فرمایا تھا کہ کوئی حرج نہیں۔ اس سے بہت ہی قوت ہوگئی تھی کہ اب تو کوئی مانع ہی نہیں رہا۔ اور میں خود اس لیے نہیں لکھ سکا کہ مجھ کو معاملات یا واقعات ہی کی خبر نہیں، اس لیے اگر تجارت پیشہ و زراعت پیشہ و ملازمت پیشہ اہل صنعت و حرفت یہ سب ان چیزوں کے متعلق واقعات بصورت استفتا جمع کر کے دے دیتے تو میں سوال و جواب کی صورت میں ان کے احکام جمع کر دیتا۔ اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہ پر جواز نہ نکلتا تو میں یہ طے کیا تھا کہ امام شافعیؒ کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا، امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا، امام احمدؒ بن حنبل کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا اور اگر ان سے بھی کوئی صورت نہ نکلے تو ان کی سہل تدابیر بتلاؤں گا کہ یوں کر لیا کرو جس صورت سے جواز نکل آتا اور اگر کوئی بات سمجھ ہی سے باہر ہوئی تو اس کا کوئی علاج نہیں، معذوری ہے۔ اور اب اتنے بڑے کام کی ہمت نہیں رہی۔ ضعف کے سبب تحمل نہیں، تکلیف ہوتی ہے۔ اب ایسا کام نہیں ہوتا۔''

(ملفوظات حکیم الامت ص ۲۱۴ جلد ۶۔ مطبوعہ ادارۂ تالیفات اشرفیہ ملتان)